ماہنامہ

حکمت بالغہ

اکتوبر 2010

مدیر: انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن اکیڈمی

جھنگ پاکستان

فون اور فیکس:- 0092-47-77628261

ای میل: hikmabaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ: http://hamditabligh.net

قرآن مجید کے ساتھ چند لمحات ۳

حرف آرزو ۵

درسِ قرآن کے اُصول و آداب ۷

تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ

مغربی زوال کا سبب بن رہا ہے ۱۲

صیہونیت ۲۰

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم
کی کتاب ''حکمت اقبال'' سے ایک باب ۳۴

والدین اور اولاد کی ذمہ داریاں ۴۳

قرآن مجید کے ساتھ چند لمحات

سورۃ الملک (67)

(6-1)

سورۃ الملک مکہ معظّمہ کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے جن میں اسلام کے تمام اصول ومبادی مختصر، جامع اور مدلل انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔اس سورۃ میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کے بیان کے ساتھ ساتھ' غفلت میں پڑے لوگوں کو دنیاوی واخروی دونوں طرح کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔اس کائنات کا مشاہدہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو ذات اس کا نظام چلا رہی ہے وہ بہت بابرکت اور بے حد قدرت والی ہے۔اس نے موت وزندگی کا یہ کارخانہ عبث نہیں بنایا بلکہ لوگوں کے امتحان کے لئے بنایا ہے کہ کون نیکی کی زندگی اختیار کرتا ہے اور کون بدی کی؟ جس کا لازمی تقاضا ہے کہ جزاوسزا کا ایک دن ضرور آئے گا۔اس نے انسان کے لئے بے شمار نعمتیں پیدا کی ہیں کہ ہر شخص عبرت حاصل کرے اور آخرت کی تیاری کرے۔سورۃ کی آخری آیت میں ایک سوال کر کے جواب مخاطب پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ذرا دیکھو کہ اگر تمہارے استعمال کا پانی ہی خشک ہو جائے تو کون ہے جو تمہارے لئے شریں پانی کا بہتا ہوا چشمہ بہالائے؟۔

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ

بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے

وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرُۨ O

اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا

اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے

کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے

وَ هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡغَفُوۡرُ O

اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے

الَّذِىۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا

اس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے

مَا تَرٰى فِىۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ

(اے دیکھنے والے) کیا تو رحمٰن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟

فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ هَلۡ تَرٰى مِنۡ فُطُوۡرٍ O

ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ بھلا تجھ کو (آسمان میں) کوئی شگاف نظر آتا ہے؟

ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَيۡنِ

پھر دوبارہ (سہ بارہ) نظر کر

يَنۡقَلِبۡ اِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيۡرٌ O

نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی

وَ لَقَدۡ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ

اور ہم نے قریب کے آسمان کو (تاروں کے) چراغوں سے زینت دی ہے

وَ جَعَلۡنٰهَا رُجُوۡمًا لِّلشَّيٰطِيۡنِ

اور ان کو شیطان کے مارنے کا آلہ بنایا ہے

وَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابَ السَّعِيۡرِ O

اور ان کے لئے دہکتی ہوئی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے

انفرادی توبہ کے ساتھ اجتماعی توبہ

انجینئر مختار فاروقی

دنیا میں خیر وشر کا معرکہ تو ابتدائے آفرینش سے جاری ہے کبھی خیر کا پلڑا بھاری ہوتا ہے تو کبھی شر کا۔ دور حاضر میں گزشتہ کئی صدیوں سے شر کا پلڑا بھاری ہوتا جا رہا ہے اور اہل حق دبائے جا رہے ہیں، ابلیس اور اس کی آل اولاد انسانوں کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ آج الیکٹرانک میڈیا اور دیگر فارغ وقت کے مشغلوں کی آڑ میں انسان کو ایسے مشاغل میں مصروف کیا جا رہا ہے جس سے انسان اپنے اندر کا شرف انسانی کھو بیٹھے، ضمیر مردہ ہو جائے، حیا ختم ہو جائے، نیکی بدی کی تمیز جاتی رہے اور یوں انسان صرف ایک ترقی یافتہ حیوان رہ جائے۔ جب انسان حیوان بن جاتا ہے تو شکل نہیں بدلتی بلکہ نظریات اور افکار بدل جاتے ہیں، انسان کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے، لباس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور عریانی اور بے لباسی کا لباس ہی لباس شمار ہوتا ہے، رشتوں کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور حلال وحرام کا احساس بھی رخصت ہو جاتا ہے۔ جس سے انسان حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے اس لئے کہ حیوان (کتا، گدھا یا بھیڑیا وغیرہ) اگر ایسا کرتا ہے تو وہ ہے ہی حیوان اور کوئی حساب نہیں ہوتا جبکہ انسان تو اشرف المخلوقات ہے اس سے زندگی کے اعمال کا حساب ہونا ہے لہٰذا اب انسان حیوان سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔

انسان کو اگر اس گراوٹ کا احساس ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے توبہ کا راستہ رکھا ہے کہ انسان سچی توبہ کرلے اور دوبارہ محنت اور عمل صالح کر کے انسانیت کا اعلیٰ شرف حاصل کرلے

یہ توبہ ـــــــــــ انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔تھوڑے لوگ برائی کے راستہ پر ہیں تو انفرادی توبہ کی دعوت ہوگی۔ جب معاشرہ قوم یا سوسائٹی مجموعی طور پر خراب ہو جائے تو انفرادی توبہ کے ساتھ اجتماعی توبہ کی منادی ضروری ہوگی۔ اجتماعی توبہ کھلے میدان میں نکل کر نماز عید کی طرح کا کوئی کا عمل نہیں ہے بلکہ ان قومی ملی اور اجتماعی مظالم اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ورزیوں سے توبہ ہے' جس سے معاشرہ برائی، بدعنوانی، بے حیائی، عریانی، فحاشی اور آزاد خیالی سے بھر جاتا ہے۔

آج کے معاشرے میں انفرادی توبہ کے ساتھ اس طرح کی اجتماعی توبہ کی شدید ضرورت ہے۔ ہر باشعور مسلمان ـــــــــــ کاش اس آواز میں آواز ملائے اور معاشرے کو آواز دے کہ آؤ ـــــــــــ اجتماعی گناہوں سے توبہ کریں۔ تا کہ ہمارے بازار، منڈیاں، کارخانے، ہسپتال، دفاتر، تھانے، کچہریاں، عدالتیں، پارلیمنٹ اور ایوان حکومت کی ساری کارکردگی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے تابع ہو جائے۔

آیئے کیوں نہ میں بھی توبہ کی اس منادی میں خود توبہ کروں اور دوسروں کو اسی بات کی دعوت دوں اور آپ بھی۔شاید ملک پاکستان کے عوام کا تاریک مستقبل تابناک ہو جائے۔آمین

درسِ قرآن کے اُصول و آداب

عبدالوحید پشاوری

یہ مضمون ماہنامہ الفاروق کراچی کے رجب 1431ھ کے شمارے میں شائع ہوا ہے
جو کہ ہمارے نزدیک بہت اہم ہے؛ اس لئے ہم اسے قرآن مجید کے طالب علموں
کے استفادہ کے لئے حکمت بالغہ میں شائع کررہے ہیں۔(ادارہ)

عوام الناس میں خدمت دین کا بہترین اور مؤثر ذریعہ ''درس قرآن'' ہے اور اس کے مؤثر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خود اللہ ﷺ نے جب لوگوں کو دین کی طرف بلانا چاہا تو قرآن کو ذریعہ بنایا۔قرآن پاک ایسی کتاب ہے جو بلاترجمہ وتفسیر بھی زندگی کا رُخ موڑنے کے لئے کافی ہے۔

دین پھیلانے والے اداروں کی موجودہ صورت کا قیام ماضی قریب میں ہوا، اس سے پہلے ''درس قرآن'' ہی کو عام طور پر اشاعت دین کا ذریعہ بنایا جاتا تھا۔اب کچھ عرصہ سے درس قرآن کی محفلوں کی رونق غائب ہوتی جارہی ہے اور قرآن کا صحیح فہم رکھنے والے ائمہ مساجد اور علماء دوسرے علمی مشاغل میں لگے تو یہ میدان خالی رہ گیا۔میدان کو خالی پاکر دو طبقے برسرعام آئے، ایک وہ طبقہ جس نے ''درس قرآن برائے درس قرآن'' کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اشاعت دین اور اصلاح معاشرہ کی بجائے اُمت کو افتراق وانتشار سے دوچار کیا اور کوئی خاطر خواہ ثمر، نتیجہ اور آؤٹ پٹ(OUT PUT) سامنے نہیں آیا۔

دوسرا وہ طبقہ ہے جو خالص انگریزی ماحول میں پلے بڑھے، جن کو کبھی عربی زبان و ادب سے واسطہ نہیں پڑا، انہوں نے اُردو تفاسیر سے ترجمہ دیکھ کر فہم قرآن کے نام سے عوام الناس میں اپنا مشن ونظریہ پھیلانا شروع کردیا۔اس مقصد کی عملی صورت کے لئے وہ کرایہ کے مکانات لے کر، ان میں لاؤڈ سپیکر کرسیاں وغیرہ مہیا کرکے اور لوگوں کو جمع کرنے کے لئے اشتہارات

چھپوا کر لاکھوں روپے خرچ کر لیتے ہیں۔ لیکن اس وقت بہت افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علماء اور ائمہ مساجد کے پاس ہر سہولت موجود ہے، جگہ موجود ہے، منبر ومحراب موجود ہیں، لاؤڈ سپیکر کا بندوبست ہے، زمین پر کارپٹ لگا ہوا ہے، لوگ دن میں پانچ مرتبہ خود بخود حاضر ہو جاتے ہیں، ان کو بلانے کے لئے اعلان نہیں کرنا پڑتا، اشتہارات نہیں چھپوانا پڑتے، سب کچھ بدرجہ اتم موجود ہیں، لیکن اگر نہیں ہے تو امام وخطیب صاحب کے دل میں درد نہیں ہے، کڑھن نہیں ہے، جو اس کو اس بات پر مجبور کرے کہ لوگوں کی اصلاح کی فکر کرے، معاشرہ بدترین برائیوں کا شکار ہے، یہ بحیثیت لوگوں کے امام کے اپنا کچھ کردار ادا کرے اور لوگوں کو اس فتنہ وفساد کے دور میں صراط مستقیم پر چلائے، جو معاشرہ کے لوگوں کا بنیادی حق ہے اور اگر کوئی نام نہاد درس (قرآن) شروع بھی کرے تو ذمے داری سمجھنے کے بجائے بوجھ سمجھ کر جان چھڑاتا ہے، ظاہر ہے ایسی حالت میں درس قرآن کی محفلیں کب بارونق ہوسکتی ہیں اور جدید مسائل سے دوچار انسانوں کے مسائل کب حل ہوسکتے ہیں اور ان کی پیاس کب بجھ سکتی ہے۔

اس لئے ائمہ مساجد اور علمائے کرام کے سامنے دست بستہ عاجزانہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ درس قرآن کو اُصول وآداب سے سرانجام دے کر اصلاح معاشرہ، اشاعت دین اور مسائل حاضرہ کے حل کا ذریعہ بنائیں۔ ذیل میں درس قرآن سے متعلق چند اصول وآداب ذکر کیے جاتے ہیں۔

☆............درس قرآن دینے والے کو اوّل اپنی نیت درست کرنی چاہیے کہ اس کے دل میں یہ درد ہو، کڑھن ہو، بے چینی ہو کہ میں نے لوگوں کو کچھ دینا ہے اور ان کو برے انجام سے بچانا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس کا دل ایسا بے چین ہو کہ لعلك باخع نفسك ان لایکونوا مؤمنین والی حالت ہو۔

☆............درس قرآن کو ایک اہم کام سمجھ کر اس کے لئے مستقل وقت نکالنا ہوتا ہے۔ اگر دل میں کام کی اہمیت ہو تو وقت خود بخود نکل آئے گا۔

☆............درس دینے میں پابندی کرنا بہت ضروری ہے، سامنے بیٹھنے والوں کی تعداد پر نظر نہ ہو، کام کی اہمیت پر نظر ہو۔

☆ ....درس قرآن کا مقصد صرف اور صرف لوگوں کی خیر خواہی ہونی چاہیے، دل میں کسی سے کسی قسم کا کوئی لالچ اور غرض پوشیدہ نہ ہو ورنہ یہ بات حق بات کے پہنچانے میں رکاوٹ بنے گی۔

☆ ....درس میں بیٹھنے والے لوگوں کی عقیدت اور اعتماد حاصل کیا جائے، اس کے لئے ضروری ہے کہ دل میں خالص ان کی صلاح کی فکر ہو۔

☆ ....مستقل سامعین کے لئے درس شروع سے رکھا جائے اور غیر مستقل سامعین کے لئے منتخبات رکھے جائیں اور کسی ایک موضوع سے متعلق ساری آیات بیان کی جائیں اور مرکزی موضوع کو مدنظر رکھا جائے۔

☆ ....زبان وبیان میں انتہائی سادگی سے کام لیا جائے ثقیل اور مشکل الفاظ کے استعمال سے اجتناب اور گریز کیا جائے، خالص آسان زبان استعمال کی جائے لیکن عامیانہ پن سے بچا جائے۔

☆ ....اردو زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں لیکن آج کل فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی ہے، اگر انگریزی الفاظ استعمال کرنے ہوں تو اس کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ استعمال ہونے والے الفاظ کے معنی ومفہوم اور پس منظر سے مکمل واقفیت ہو، ورنہ ہرگز استعمال نہ کرے۔

☆ ....کسی علمی بات کو سامع تک پہنچانے کے لئے آسان سے آسان الفاظ کا انتخاب کرے تاکہ سامع کا ذہن اس کو قبول کرنے پر جلد آمادہ ہو۔

☆ ....قرآنی آیات کو ان کے شان نزول کے ساتھ محدود نہ کیا جائے۔ قرآن پاک زندہ جاوید کتاب ہے، ہر زمانہ کے لئے یکساں طور پر بھیجا گیا ہے۔ آج کل ہوتا یہ ہے کہ آیات کو ان کے شان نزول کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے، جن کی وجہ سے موجودہ زمانہ اور بعد میں رونما ہونے والے واقعات کے ساتھ ان کی تطبیق کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا اور لاشعوری طور پر سامعین کا ذہن یہ بنتا جاتا ہے کہ اللہ نے عرب کے ایک معاشرے پر صرف تبصرہ کیا ہے، اس سے آگے ان کے ذہنوں میں کیا بات آسکتی ہے جب خود درس دینے والے کے ذہن میں کچھ نہیں ہو۔

☆ ....عام طور پر زیر درس آیات کا ماقبل آیات سے ربط بیان کیا جاتا ہے، پھر ربط کبھی ظاہر ہوتا ہے کبھی خفی، کبھی ضعیف ہوتا ہے کبھی قوی، یہ علمی بحثیں ہیں، ان کا تعلق علماء سے ہے، عوام کے

سامنے ان بحثوں کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

☆............قرآنی آیات عصری تطبیق کے ساتھ پیش کی جائیں، مثلاً اصحابِ بدر کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا ہماری زندگیوں سے کیا تعلق ہے اور موجودہ زمانہ کے لئے ان سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے۔

☆............آیات کی عصری تطبیق پر قادر نہ ہونا اور موجودہ حالات پر آیات قرآنی کی روشنی میں تبصرہ نہ کر پانا، عقل کے ناقص ہونے کی علامت ہے۔

☆............آیات کی عصری تطبیق کے لئے خارجی مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے۔ معیاری مواد، معتبر جرائد اور رسائل اور مستند محققین اور مصنّفین کی کتابیں زیر مطالعہ ہونی چاہئیں۔

☆............ درس دینے والے کو اپ ڈیٹ رہنا چاہیے۔ بلا استثنا کے ہر کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے، مختلف موضاعات کو زیر فکر رکھنا چاہیے۔

☆............ دینی علوم کے ساتھ عصری علوم میں بھی مہارت ہو۔ سامعین کو بوریت سے بچانے کے لئے سیرت و تاریخ اور ''سائنس و قرآن'' پر لکھی گئی کتابیں مطالعہ میں رکھنا ضروری ہے۔

☆............درس کے لئے جتنا مطالعہ کیا ہے سب کو بیک وقت سنانا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ موقع کا انتظار کرنا چاہیے۔

☆............درس کے بعد سوالات کا موقع دینا چاہیے، اگر اپنے اوپر اعتماد نہ ہو تو شروع میں یہ وقفہ کم رکھا جائے اور سامعین کے سامنے یہ وضاحت کی جائے کہ سوالات کا یہ وقفہ آہستہ آہستہ بڑھائیں گے۔

☆............یومیہ درس کے لئے تین گنا زیادہ مطالعہ کرنا چاہیے، مطالعہ کا ایک ثلث بیان کرنے کے لئے، دوسرا ثلث سوالات کے جوابات دینے کے لئے اور تیسرا اور آخری ثلث متوقع سوالات کی نیت سے کرنا چاہیے۔

☆............عام طور پر سامعین کے ذہنوں پر مختلف نظریات سوار ہوتے ہیں، کچھ باتیں اُنہوں نے میڈیا سے سنی ہوتی ہیں، کچھ باتیں گمراہ اور بدعتی لوگوں سے سنی ہوتی ہیں اور کچھ باتیں درس میں سنی ہیں تو جو باتیں یہاں درس میں سنتے ہیں ان میں اتنی طاقت ہونی چاہیے جو ان کے ذہنوں

سے باقی سارے نظریات مٹا سکے اور یہ مقصد اس وقت حاصل ہوگا جب درس دینے والے کی تیاری پہلے سے اتم اور اکمل ہو۔

☆............متعلقہ کتابوں کے علاوہ جدید کتابوں کا اپنا ایک منتخب مطالعہ بھی ہو چاہیے اور اس سے قبل اس پر ایک نظر ڈال لی جائے ہوسکتا ہے اس میں کسی سوال کا جواب نظر سے گزر جائے۔

☆............ہر مرتبہ درس دینے سے پہلے اور بعد میں سامعین کے اندر اعمال اور عقائد کے لحاظ سے تبدیلی آنی چاہیے۔

☆............سامعین کی دلچسپی بڑھانے کے لئے سارے اوقات مشغول رکھے جائیں، روزانہ درس دینے کے علاوہ ہفتہ وار، ماہانہ اور سالانہ اجتماعات منعقد کیے جائیں۔

☆............ہر عمر کے افراد کیلئے الگ الگ اجتماعات منعقد کیے جائیں مثلاً نوجوانوں کیلئے علیحدہ، بوڑھوں کے لئے علیحدہ، بچوں کیلئے علیحدہ اور خواتین کے لئے علیحدہ پروگرام رکھے جائیں۔

☆............بنیادی طور پر ہمارا فرض منصبی یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کو ہر حال میں باطل نظریات سے بچانا ہے اور ان کو حق اور اہل حق کے ساتھ وابستہ کرنا ہے۔

☆............عموماً وسائل کی کمی کا رونا رویا جاتا ہے، لیکن اگر دل میں تڑپ ہو، درد ہو، کڑھن ہو، راتوں کو اللہ سے مانگنا آتا ہو تو پھر مقاصد وسائل خود پیدا کرتے ہیں اور عزائم راستے خود ڈھونڈتے ہیں۔

مندرجہ بالا اُصول وآداب بروئے کار لاتے ہوئے، اگر درس قرآن دیا جائے تو بہت ہی کارآمد ثابت ہوتا ہے، اگرچہ یہ تھوڑا پُر مشقت کام ہے لیکن اس کے صلہ میں جو تسخیر حاصل ہوگی اس پر پوری دنیا کو قربان کرنے کو جی چاہے گا، دلوں کے لگام ہاتھ میں آجائیں گے، پھر اس بات کا امکان سرے سے ختم ہو جائے گا کہ کوئی شخص حلقۂ درس سے نکل کر غیروں کے پاس چلا جائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ

مغربی زوال کا سبب بن رہا ہے

انجینئر مختار فاروقی

مغربی یورپ میں ہسپانیہ (سپین یا اُندلس) کبھی مسلم تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا۔ 711ء میں طارق بن زیاد رحمہ اللہ کا کشتیاں جلا کر یورپ میں داخلہ تاریخ عالم کا ایک منفرد باب ہے یورپ میں علم کے فروغ اور اعلیٰ انسانی اقدار کی نشوونما کا آغاز بھی آٹھ صدیوں پر محیط' عرب مسلمانوں کے پُرامن دورِحکومت کے ذریعے ہی ممکن ہوا۔ تاریخ عالم کا یہ سنہری دور دنیا کے عروج وزوال کے فطری قوانین کے تحت ختم ہونا ہی تھا تاہم یہ آٹھ صدیاں نہ صرف مغربی یورپ بلکہ پورے یورپ کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوئیں جس سے یورپی اقوام کے مزاج، فکر وفلسفہ، آرٹ، فنون، تعمیرات بلکہ اخلاق وکردار اور نفسیات تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مغربی یورپ میں یہ مسلم عرب ریاست' آسمانی ہدایت اور پیغمبر آخرالزمان حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں جنت ارضی سے کم نہیں تھی۔ باقی دنیا میں پھیلی ہوئی عباسی حکومت سے الگ تھلگ اس ریاست کو ہر چار طرف سے عیسائیت کے مراکز نے گھیر رکھا تھا' جبل الطارق (جبرالٹر) سے ایک راستہ صرف شمالی افریقہ کے قریب تھا جس سے باقی دنیا کے مسلمانوں سے عوامی رابطہ ممکن تھا۔ مشرقی راستہ قسطنطنیہ میں رومی شہنشاہوں کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے ناقابل عبور تھا۔

قسطنطنیہ، اٹلی، وینس، یونان، مالٹا، فرانس اور برطانیہ کے مسیحی مراکز میں گھرا یہ'ہسپانیہ' اگر کئی صدیاں یورپ کے لئے IDEAL اور ROLE MODEL کے طور پر صفحۂ ہستی پہ موجود رہا تو یہ صرف اور صرف مسلمانوں کے پاکیزہ عقائد، اعلیٰ اخلاق، اعلیٰ کردار، انفرادی واجتماعی فلاحی ترقی، علم دوستی اور اقلیتوں پر بے تحاشہ احسانات کا نتیجہ تھا۔

یورپ کی موجودہ ترقی اور برتری کی بنیادوں میں ہسپانیہ کے مسلم دورحکومت 711ء تا 1492ء کے دور مسعود کا جتنا دخل ہے اس کا ادراک آج نہ یورپ کی نئی نسل کو ہے نہ مسلمانوں کو۔ آج کی چکاچوند ترقی میں مسلمان عربوں کی طویل محنت اور علمی ترقی کا بہت حصہ ہے، یورپ پر عربوں کے احسانات اس قدر زیادہ ہیں کہ اہل علم اسے شمار نہیں کر سکتے۔ اس دور میں علم کی روشنی اور تہذیب وتمدن نام کی کوئی شئے اگر یورپ میں تھی تو وہ صرف مسلم سپین میں تھی۔ پورے یورپ سے مسیحی نوجوان غرناطہ اور اشبیہ کی یونیورسٹیوں میں اسی طرح کھنچے چلے آتے تھے جیسے آج لوگ مغربی یونیورسٹیوں کا رُخ کرتے ہیں (تاہم آج کی مغربی تعلیم جس طرح علم کے متلاشوں کو مصنوعی آزادی کا 'لالی پاپ' دے کر انسان سے حیوان بنا دیتی ہے اور اعلیٰ کردار واخلاق سے بے بہرہ کر دیتی ہے یہ مغربی تہذیب کا کمال ہے مسلم سپین کی درسگاہوں میں ایسی بے معنی تعلیم نہیں دی جاتی تھی) نصف صدی قبل تک مغربی مصنّفین بھی مغربی یورپ کے مسلم عروج کے بالمقابل مسیحی یورپ کی جہالت اور علم دشمنی کو DARK AGES کہتے ہیں۔

مسلم سپین (ہسپانیہ) یا اُندلس میں یہود بھی اپنے دور انتشار کے باعث مقیم تھے مگر آپ 'یہود' کا لٹریچر دیکھیں، ان کے قلمکار اور شعرا حضرات مسلم سپین کی ترقی، علم دوستی، اقلیتوں پر احسانات کا تذکرہ کرتے تھک جاتے ہیں، معاشی آسودگی اور مساوات انسانی کے ساتھ ساتھ اقلیتوں پر مسلم احسانات کے تذکرے کے لئے انہیں الفاظ نہیں ملتے۔ اسرائیلی شعراء اس مسلم سپین کے دور کو اپنے دورِ انتشار (DIASPORRA) کا 'مثالی دور' کہتے ہیں۔ یہود کو کئی صدیاں آرام وسکون کے ماحول میں عزت ووقار کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع مسلمانوں نے فراہم کیا (مگر کیا کیا جائے فطرت نہیں بدلتی مشہور کہاوت ہے کہ 'تم سانپ کو پالو پوسو ایک دن تمہیں ہی کاٹ لے گا' یا عربی محاورہ ہے "سَمِّنْ كَلْبَكَ يَأْكُلَكَ" (تم اپنے کتے کو پال پوس کر موٹا کرو وہ خود تمہیں ایک دن کاٹ کھائے گا)۔ آج یہی یہود مشرق وسطیٰ میں عربوں کو نیست ونابود کرنے کے درپے ہیں شاید عبرانی ڈکشنری میں کسی کے احسان کا بدلہ دینے کا یہی مطلب درج ہوگا۔)

یورپ میں مسلمانوں کے زوال کے پیش نظر یہود نے پہلے سے منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ اُن کے منصوبہ کی تفصیلات تو کہیں کتابوں میں درج نہیں تاہم اس دوران مشرق سے

یورپ کے ایشیائی راستہ پر صدیوں سے محافظ کا کردار کرنے والا رومی سلطنت کا پایۂ تخت قسطنطنیہ 1453ء میں سلطان محمد فاتح رحمہ اللہ کے ہاتھوں فتح ہو کر مسلم سلطنت میں شامل ہو گیا اس سے مشرقی یورپ کے بیشتر ممالک اسلامی سلطنت کا حصہ بن گئے اور یورپ میں اسلام کی اشاعت کے راستے کھل گئے۔ایک وقت میں مسلمان افواج مشرق سے فرانس کے قلب پیرس کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ان واقعات سے یہود اور اس کے کاشتہ کیتھولک مسیحی فرقہ (اور بعد میں پروٹسٹنٹ) کے ایوانوں میں بھونچال آ گیا اور مسلم کُشی کی سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں۔

مغربی اقوام (یورپ اور اب امریکہ) پہلے روز سے ہی اسلام دشمن اور مسلم کُش پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں اور تاریخ اس کی گواہ ہے۔صرف اس وضاحت کے ساتھ کہ یہود نے میدان جنگ میں مقابلہ کر کے مسلمانوں کو ختم کرنے کی بجائے طویل المیعاد منصوبوں کے ذریعے قرآن، اسلام، حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات اور اسلامی تہذیب کو دنیا سے مٹا دینے کا عزم مصمم کر رکھا ہے۔

کلام اقبال میں 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' برطانوی سامراج کے عروج کے دور میں ایک درویش خدامست شاعر کا واشگاف الفاظ میں اعلان تھا کہ مغربی کارپرداز اور راہنما و زعماء مسلمانوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔علامہ اقبال کے نزدیک مغربی اقوام کے منصوبے ابلیسی منصوبے ہیں اور ان کی پالیسیاں ابلیسی سوچ کی حامل ہیں تاکہ دنیا میں امانت، دیانت، شرافت، شرم وحیاء، انسانیت، اعلیٰ انسانی اخلاقی اقدار سب کچھ آہستہ آہستہ ختم کر دیا جائے۔چنانچہ ابلیس نے کہا ہے:

ے جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

مسلمانوں کو دین سے دور کرنے، آپس میں تقسیم کرنے، زبان، نسل اور قومیت کی بنیاد پر سلطنتوں میں تقسیم کے عمل کے ذریعے عثمانی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو مسلمان ایک عالمی طاقت کی بجائے چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ گئے۔یہ حکومتیں قومی بنیادوں پر علاقائی زبانوں اور نسلوں کی برتری کے احساسات کو نمایاں کرنے لگیں۔مشرق وسطیٰ کی 'عرب' قوم کی لاتعداد چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم اور آپس کی دشمنی اس کی واضح مثال ہے۔

نظام تعلیم میں مغربی مداخلت اصلاح وتجدید کے نام پر اسلامی تعلیمات کا صفایا اور اخلاقیات کا خاتمہ کر دیا گیا مذہب اور دین کا معاملہ تقابل ادیان یا مکالمہ بین المذاہب تک محدود کر دیا گیا تا کہ 'مسلم نوجوان' کے ذہن میں حضرت محمد ﷺ کے آخری اور کامل نبی ہونے کا تصور اسلام کی حتمی تعلیمات اور ختم نبوت جیسے معاملات کا نقشہ بالکل دھندلا جائے اور وہ اس سے لاتعلق ہوتا چلا جائے۔

مغربی اقوام ان پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں اور UNO، WB، IMF کے مسیحی مشنز (CHRISTIAN MISSION) اور مسیحی تعلیمی اداروں کے علاوہ اب NGO's کے ذریعے دین سے بیزاری، بے حیائی اور آزادی کے ساتھ حیوانیت کو پھیلانے میں مصروف ہیں۔

گزشتہ کئی صدیوں کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود 2000ء تک جو حالات تھے وہ سب کو معلوم ہیں کہ مغرب کے ایک دانشور (P.HUNGTINGTON) نے 'تہذیبوں کا تصادم' (CLASH OF CIVILISATIONS) کے نام سے ایک کتاب لکھ دی۔ جس میں موجودہ مغربی تہذیب کی خوبیاں گنوائیں اور مغرب کی بالادستی کا راگ الاپا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مغربی تہذیب ہی اصل انسانی تہذیب ہے اور مصنف کے بقول اب یہ مغربی تہذیب انسانیت کے فائدے کے لئے باقی رہنی چاہیے۔ مغربی تہذیب کی بقاء کا دل خوش کن 'خواب' گزشتہ ڈیڑھ صدی سے مغربی دانشوروں نے عوام کے ذہنوں میں ڈالا ہے اور وہ اپنے عوام کو یہی باور کرا رہے ہیں کہ ہماری تہذیب اب دنیا کی آخری تہذیب ہے اور ان کے خیالات ونظریات، آرٹ، فنون اور لائف سٹائل ہی تہذیبوں کا 'خاتم' اور انسانی نظریات کی تکمیل ہے۔ ایک اور مغربی مصنف نے (END OF HISTORY) نامی کتاب لکھ کر اپنی اسی بچگانہ سوچ کو سہارا دینے کی کوشش کی اور ایک جھوٹی تسلی (PSEUDO SATISFACTION) کا خود بھی شکار ہو گیا اور مغربی تہذیب کے کروڑوں پرستاروں کو بھی وقتی ذہنی 'سرور' دے گیا۔

مشہور برطانوی مصنف برٹرینڈ رسل (1873-1971) لکھتا ہے کہ میرے جوانی کے دور میں (گویا 1890ء کے لگ بھگ) یہ بات برطانیہ میں ہر چھوٹے بڑے کے ذہن میں ایک اُصول موضوعہ کے طور پر تھی کہ برطانوی سلطنت اور اقتدار دائمی ہے کبھی ختم نہیں ہوگا۔ مگر

حالات نے ساٹھ ستر سال بعد ہی بتا دیا کہ برطانوی اقتدار ایک جزیرے تک محدود ہو گیا اور وہ بھی امریکی سرپرستی کا محتاج ہے۔

تہذیبی برتری اور بقائے دوام کا یہی سودائے خام یا دھوکہ گزشتہ نصف صدی سے اب امریکی کارپردازوں کو چھو گیا ہے کہ امریکی تہذیب اور لائف سٹائل ہی دنیا کی آخری تہذیب اور حتمی اندازِ زندگی ہے بس۔۔۔ گویا ــــــــــ مریکی اعلیٰ دماغوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ ان کے خود ساختہ نظریات، تہذیب وتمدن، طرز زندگی اور کھیل کود کے ذرائع ہی (جو سراسر فطرت انسانی اور اعلیٰ انسانی اقدار کے منافی ہیں اور شیطانی اور ابلیسی مزاج رکھتے ہیں) انسانیت کی معراج اور انسانی تجربات کا حاصل ہیں۔

جبکہ ــــــــــ تاریخ شاہد ہے کہ یمن کے قدیم باشندے ہوں یا عراق اور مصر کے مقتدر بادشاہ سب اپنے زمانے میں یہی راگ الاپ کر دنیا سے رخصت ہو گئے آج ان کا تذکرہ صرف کتابوں میں ہے نام باقی ہے تو عراق کے نمرود خاندان کے مقابلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کے نزدیک انتہائی قابل احترام شخصیت ہیں۔ مصر کے فراعنہ کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جنہوں نے وقت کے مطلق العنان بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور بنی اسرائیل کو غلامی سے آزادی دلائی جبکہ فرعون اپنے سارے 'اتحادیوں' سمیت 'سویز' میں غرق ہو گیا۔

تہذیبوں کا تصادم اور END OF HISTORY جیسی کتابوں سے امریکی اور مغربی منصوبہ سازوں نے چین کی کنفیوشش تہذیب اور مسلم تہذیب کو اپنے راستے کے پتھر سمجھا اور ان کو ہٹانے اور ختم کرنے کے منصوبے بنائے۔ چین کی اقتصادی برتری اور مسلم تہذیب میں اخلاقی اصول، روحانیت، اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت اور ان کے احکام کی برتری کا یقین آج کی امریکی پالیسی میں ان کے دشمن ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں سے امریکہ اسی پالیسی پر گامزن

ہے چین کو تو انہوں نے کسی قدر رام کر لیا ہے اور اس کی طرف سے خطرہ کم ہو گیا ہے مگر مسلم دنیا نائن الیون کے فرضی ڈرامے کے بعد سے امریکی HIT LIST پر ہے اور مسلمانوں کی تباہی اس کی قومی خارجہ پالیسی کا CORNER STONE ہے۔ عراق پر قبضہ اور پاکستان/افغانستان میں فوج کشی اسی پالیسی کا حصہ ہیں۔ ان کے نزدیک امریکہ کو ان تہذیبی دشمنوں میں سے ڈیڑھ دو ارب انسانوں کو ختم بھی کرنا پڑے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اس مقصد کے لئے امریکی منصوبہ سازوں نے تباہی پھیلانے والے کیمیکلز کا سپرے اور بیماریوں کے جراثیم کا وسیع علاقوں پر سپرے جیسے منصوبے تیار کر رکھے ہیں اور عنقریب مشرق وسطیٰ میں آزمائے جانے والے ہیں تاکہ مسلمان عوام کو ختم کر دیا جائے۔

آج کے معرکۂ حق و باطل میں ابلیس کو یورپ کی مشینوں (اور امریکی وسائل) کا سہارا ہے جبکہ دوسری طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت کے امین اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چچازاد حضرت محمد ﷺ تورات، زبور اور انجیل کے سلسلہ کی آخری کتاب قرآن مجید کے وارث ہیں اور سلسلہ نبوت و رسالت کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کے لئے مختص ہو جانے کے بعد آخری پیغمبر ہیں (جن پر یہود و نصاریٰ کو آلِ ابراہیمؑ کے حوالے سے ایمان لانا ضروری ہے اور تورات و انجیل میں اس کی طرف آج بھی اشارے موجود ہیں)

انہیں حضرت محمد ﷺ کی امت ———— امت مسلمہ آج آسمانی بادشاہت، وحی، نبوت و رسالت، آسمانی ہدایت اور شریعت کی امین ہے۔

اس حقیقت کے لئے کوئی ٹائم ٹیبل تو نہیں دیا جا سکتا مگر یہ بات طے ہے کہ فتح بالآخر حق کی ہو گی اور عالمی سطح پر ایک انسان دوست، علم دوست، جدید مسلم جمہوری فلاحی ریاست کا قیام عمل میں آئے گا۔

تہذیبوں کے عروج و زوال کا ایک فطری قانون ہے' انسانی زندگی کے مختلف مراحل ہیں یعنی بچپن، لڑکپن، جوانی، پختہ عمر، بڑھاپا اور موت۔ اسی طرح تہذیبیں، بادشاہتیں، شاہی

خاندان اُٹھتے ہیں کئی صدیاں خدائی کے دعوے کرکے اقتدار کے مزے لوٹتے ہیں، غلطیاں کرتے ہیں، بے حیائی میں آگے بڑھ جاتے ہیں اور بالآخر فنا ہو جاتے ہیں۔ اس اُصول سے خود مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں رہے دوسرے کیسے ہوں گے۔

شاید برطانیہ کو عروج کے بعد زوال کے اس آفاقی اُصول کی کچھ سمجھ آگئی ہو______ کاش امریکہ کے انسان نما حیوان کارپردازوں اور رہنماؤں (BEASTS) کو بھی کوئی سمجھائے کہ ہر عروج کے بعد زوال ہے اور ہر کمال کے بعد نیستی ہے۔

تاریخ انسانی گواہ ہے کہ دنیا میں ہزاروں تہذیبیں اُٹھیں عروج کا دور دیکھا ظلم وستم کا بازار گرم کر دیا بے حیائی اور بے اُصولی کے ریکارڈ توڑ دیئے اور بالآخر فنا ہو گئیں۔ روئے ارضی ایسی ہزاروں لاکھوں تہذیبوں کا قبرستان ہے۔ اسی قبرستان میں عیاش مسلمان عباسی خلفاء بھی محوخواب ہیں اور آخری دور کے مغل حکمران بھی اور یہیں برطانیہ کے کارپردازوں اور امریکی زعماء کو بھی جگہ ملنا ہے مگر اچھی بات یہ ہے اور عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کو اس حقیقت کا ادراک ہو جائے تاکہ وہ اس مرحلے سے بھی باعزت طریقے پر گزر سکے______ وگرنہ قانون قدرت بے رحم اور بے لاگ ہے جو فرعونوں، نمرودوں، ابوجہلوں اور بوالہوسوں کو مہلت تو دیتا ہے کہ توبہ کرلیں مگر مستثنیٰ نہیں کرتا۔

اسی عقلمندی کا تقاضا ہے کہ دنیا بھر کے دانشوروں کو بالعموم اور مسلمان زعماء کو بالخصوص 'امریکہ کے زوال کے بعد' یا POST AMERICAN-DECLINE کے حالات کو سامنے رکھ کر تیاری کرنی چاہیے۔ افغانستان، عراق اور فلسطین وکشمیر میں ناحق بہنے والا مسلم خون رائیگاں نہیں جائے گا اور مغربی، بھارتی اور ابلیسی قوتوں سے نبرد آزما مسلمان نوجوان جب امریکہ کو زوال سے دوچار کر دے گا تو مستقبل کس کا ہوگا یہ فیصلہ نوشتہ دیوار ہے۔

ع جو ہاتھ بڑھا کے اُٹھا لے جام اسی کا ہے (بقیہ صفحہ 64 پر)

عالمی طاقتیں ان حقائق کو تسلیم نہیں کر سکتیں اور ان کی خواہش ہے کہ کہیں سرفروشان اسلام اور سربکف طالبان مستقبل کی سپر طاقت نہ بن جائیں۔ مگر______ بعض تاریخی فیصلے دفتروں اور ایوانوں میں نہیں میدان جنگ میں اسلحہ اور تلوار کی نوک سے لکھے جاتے ہیں اور کیا

عجیب کہ وہ فیصلے لکھے جا چکے ہوں اور سیاہی سوکھ چکی ہو......صرف...... پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ کہ آنے والے دور کا دولہا اور POST AMERICAN-DECLINE' سپر پاور کون ہے؟

صیہونیّت

باب دوم

صیہونیت 600ق م سے 610ء تک

تورات، زبور اور انجیل جو اپنی اصل شکل اور متن کے ساتھ دنیا میں نہیں ہیں اس کی حقیقی وجہ کیا ہے؟ وہ ان کتابوں کے ماننے والے یہودی اور نصرانی ہی بتا سکتے ہیں اور اس کا علم بھی انہیں کے پاس ہوگا کہ یہ آسمانی کتابیں کیوں؟ کب؟ اور کیسے دنیا سے غائب ہوگئیں اور موجودہ بائبل [عہدنامہ قدیم (OLD TESTAMENT) اور عہد نامہ جدید (NEW TESTAMENT)] کا ان اصلی کتابوں سے رشتہ اور تعلق کیا ہے؟۔

قرآن مجید ــــــــــــــ تورات، زبور اور انجیل کے آسمانی سلسلۂ انزالِ کتب کی آخری کتاب ہے اور آج بھی اپنی اصل شکل میں روئے ارضی پر ہر جگہ ملتی ہے اور یہود و نصاریٰ کے بعض منصوبوں اور عزائم کا راز فاش کرتی ہے اسی لئے اس قرآن مجید کو جلانے اور اس کی بے حرمتی کے دیگر واقعات ہوتے رہتے ہیں یہ ساری کارستانی اسی خاص گروہ کی ہے جو ZOINISTS کہلاتے ہیں۔ اسی گروہ کی بہت ساری تفاصیل قرآن پاک میں موجود ہیں۔ حکمت بالغہ میں اس گروہ کے تعارف کے سلسلہ میں باب دوم یہاں پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

صیہونیت 600ق م سے 610ء تک

(حصہ I)

انجینئر مختار فاروقی

قبل از اسلام انسانی بادشاہتوں اور معاشروں کی اخلاقی اور فکری حالت کا ایک مختصر جائزہ

600 ق م سے 610ء تک بارہ صدیاں بنتی ہیں اور تاریخ انسانی کا مطالعہ کرنے والے طالب علموں کے لئے ــــــــــــ آج تک کی گردش لیل ونہار میں فکری سطح پر اور فلسفیانہ لحاظ سے یہ بارہ صدیاں بہت اہم ہیں اس لئے کہ حقائق گواہ ہیں کہ دنیا بھر کے سارے فلسفے اور آسمانی ہدایت سے ہٹ کر (یا علوم انبیاء، علم اسلام اور علوم وحی سے بالا رادہ گریز کی راہ اختیار کرتے ہوئے) جتنے بھی انسانی سوچ کے دھارے اور SHADES ہو سکتے تھے وہ سب کے سب انہیں صدیوں میں سامنے آئے ہیں۔

دنیا کے نقشے پر نگاہ جمائیں تو فلسفہ وفکر کے قدیم مراکز مغرب میں یونان، وسطی علاقے میں ایران، جنوبی ایشیا میں ہند اور ہمالہ کے پار شمالی علاقہ میں چین ہی شمار ہوتے ہیں۔ ان بارہ صدیوں میں ان علاقوں سے فکر انسانی کے ایک خاص انداز میں بظاہر مختلف مگر باہم ملتے جلتے (فلسفے کے) مکاتب فکر وجود میں آئے اور انسانوں کا ایک فہیم اور باصلاحیت عنصر اس خاص رخ پر آگے بڑھا اور سینکڑوں نہیں ہزاروں فلسفیوں اور وحی آسمانی سے بیزار لوگوں کی ایک ایسی کھیپ سامنے آگئی جو اس وقت تک کے انسانی مسائل کا حل اور ذہنی اور فکری پریشانیوں کا مداوا صرف اور صرف انسانی سوچ اور مشاہدے میں تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا۔

فطرت انسانی کو خالق ارض وسماء نے ایک خاص طرز پر بنایا ہے

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا (الروم۔30)

''اللہ کی فطرت (اختیار کیے رکھو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے''

اورانسان کی فطرت میں بے پناہ صلاحیتیں رکھ دی ہیں ان میں اللہ کی محبت، نیکی سے محبت، بدی سے نفرت، نیکی و بدی کی تمیز وغیرہ نمایاں ہیں، جن کا ذاتی تجربہ ہر بالغ باشعور انسان کو روزانہ کئی مرتبہ ہوتا ہے ان احساسات کا حاصل یہ ہے کہ انسان ایسے اخلاقی اور روحانی ضابطوں کے تحت زندگی بسر کرے جن کی ٹھوس بنیادیں انسانی فطرت میں پہلے ہی موجود ہیں، خارج میں انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد، آسمانی ہدایت اور صحائف و کتب کا آنا تاریخ انسانی کی ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کو کوئی کور چشم اور بد باطن شخص ہی جھٹلا سکتا ہے ہزاروں لاکھوں ایسے عالی مرتبہ اور بلند کردار لوگ آئے ہیں جو اپنی دنیاوی اغراض سے ہٹ کر صرف خلق خدا کی بھلائی اور روحانی ترقی کے لئے خالق ارض و سما کی طرف سے اتاری ہوئی وحی و احکام کو تکلیفیں اور مصائب جھیل کر بھی انسانوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔

آسمانی وحی اور روحانی و اخلاقی ضابطوں کی موجودگی میں ہر انسان کے اندر ایک دبی ہوئی خواہش یہ بھی موجود ہے کہ وہ اپنی مرضی بھی کرے، اپنی پسند کا کھائے، اپنی پسند کا مکان بنائے، اپنی پسند اور چاہت کا جیسے چاہے لباس پہنے وغیرہ وغیرہ۔ انسان کی اس معصوم خواہش کو خالق ارض و سماء سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (50-16)

''اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور جو خیالات اس کے دل میں گزرتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں''

اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس دبی ہوئی خواہش کو مناسب اہمیت دی ہے مباحات کا میدان ہے جس میں انسان اپنی پسند کے مطابق عمل کر سکتا ہے اور اس کیلئے 'اختیار' کا ایک باب کھولا ہے اور جبر اور اختیار کے درمیان ایک حسین اعتدال پیدا فرمایا ہے جو آسمانی ہدایت کی روح رواں ہے۔

ہر انسان اس مزاج اور اپنے اندر کی دل کی دنیا کو بناتے بگاڑتے آج بھی زندگی گزار رہا ہے کوئی اس تگ و دو میں اپنے باطن اور خارج کی کشمکش میں اپنے اندر ودیعت شدہ صلاحیتوں کو

کام میں لاکر رضائے الٰہی کے حصول میں کامیاب ہوجاتا ہے جبکہ ـــــــــــــــ ایک دوسرا انسان خارجی ماحول اور باطنی احساسات کی غلط تشریح کرکے اپنے آپ کو بگاڑ لیتا ہے اور دنیا سے ناکام و نامراد چلا جاتا ہے۔ ہر دو قسم کے لوگ انسانی زندگی کے اگلے مراحل برزخ اور قیامت کی طرف محو سفر رہتے ہیں تا آنکہ ہم میں سے ہر شخص روزِ قیامت ان مراحل سے گزر کر کامیابی اور ناکامی سے بھی ہمکنار ہو جائے گا۔

ہر انسان میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اخلاقی و روحانی ضابطوں سے پہلو تہی کا مادہ اور جذبہ موجود ہے یہ آج کے انسان کا بھی ذاتی احساس اور تجربہ ہے اور آج سے چھ ہزار سال قبل کے انسان کا تجربہ بھی ایسا ہی تھا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے دور میں بھی انسان کے احساسات یہی تھے اور 600 ق م میں بھی یہی تھے۔

انسانی فطری داعیات میں سے یہ باغیانہ داعیہ ایک حد کے اندر رہے تو اس کی معافی بھی ہے اور علاج بھی۔ پھر یہ داعیہ انفرادی سطح پر ہو یا ایک معاشرے کی سطح پر ہو تو بھی اس کا علاج اور اصلاح ممکن ہے لیکن یہی داعیہ جب بڑھ کر پوری انسانی آبادی اور کسی بڑے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور اصلاحی اور مصلحانہ کوششیں بے کار ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ایسے معاشروں کو ملیا میٹ کرتا رہا ہے اور انبیاء و رسل علیہم السلام کے مسلسل انکار پر عذاب الٰہی آتے رہے ہیں اور تاریخ انسانی کے تمام معاشرے اپنے تاریخی اثاثے میں اس بات کے حق ہونے کے اتنے وافر ثبوت چھپائے ہوئے ہیں جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔

اس باب میں زیر بحث 12 صدیوں پر محیط زمانہ پر بحث سے ایک اور حقیقت کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے جو قرآن مجید کے طالب علموں کے لئے تو نئی نہیں ہے تاہم تاریخی حقائق پر گفتگو کرتے ہوئے اس کا تذکرہ بہت کم سننے میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (03-33)

''اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور خاندان ابراہیمؑ اور خاندانِ عمران کو تمام جہان

کے لوگوں میں منتخب فرمایا تھا‘‘

حضرت آدم علیہ السلام کی نسل میں پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو چنا گیا یہ چناؤ اس معنی میں تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے (5000۔6000ق م) میں غالبًا انسانی آبادی صرف دریائے دجلہ و فرات کے دوآبے میں ہی تھی اور طوفانِ نوح میں اہل ایمان کے علاوہ ساری آبادی غرق ہوگئی۔ اہل ایمان بھی زیادہ تر حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد و احفاد ہی تھے لہٰذا ــــــــــــ بعد کی نسل انسانی آپؑ کی اولاد ہی ہے اور یوں آپ کو 'آدم ثانی' کا لقب بھی دیا گیا ہے۔

تاریخ انسانی میں اسی طرح کا ایک موڑ (TURNING POINT) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات اقدس سے آیا ہے اللہ تعالی نے آپ کو کئی امتحانوں میں ڈالا جن سے آپ سرخرو ہوئے تو تاریخ انسانی کے اگلے تدریجی اور ارتقائی مراحل کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاندان میں نبوت و رسالت محدود کردینے کا فیصلہ کیا تو یہ تاج حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سر پر رکھا گیا اور یقیناً وہی اس کے اہل تھے۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا وَّ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ جَعَلۡنَا فِىۡ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الۡكِتٰبَ...... (57۔26)

''اور ہم نے نوح اور ابراہیم (علیہا السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا اور ان کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب (کے سلسلے) کو وقتاً فوقتاً جاری رکھا''

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد صرف ان کی اولاد میں ہی نبوت و رسالت اور کتابوں کا سلسلہ جاری ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے (جس کا تذکرہ لازماً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں عام تھا اور آسمانی کتابوں تورات، زبور اور انجیل میں بھی نمایاں ہوگا) کے بعد تاریخ انسانی پر بڑے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے الگ الگ قوموں میں نبوت و رسالت جاری رکھنے کی بجائے انسانی ترقی اور بڑی سلطنتوں کے قیام کے بعد ایک نسل میں ہدایت کو آگے بڑھانے (ابتدائی درجات سے تکمیلی مراحل تک لے جانے) کے سلسلہ کا آغاز فرمایا۔

اس انتہائی تاریخی فیصلے کے بعد اب یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے اور اصول

موضوعہ کے طور پر سامنے رہنی چاہیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ تقریباً 2000 ق م کا ہے لہٰذا اس وقت اگر کوئی نبی یا رسول علیہ السلام دنیا میں تھے (جیسے حضرت لوط علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام یا دیگر اقصائے عالم کے علاقوں میں) تو الگ بات ہے۔ حضرت ابراہیم کے بعد ان کے اولاد سے باہر دنیا میں کہیں کوئی اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا انسان نبوت و رسالت کے دعوے کے ساتھ سامنے نہیں آیا۔

مشیت ایزدی کے اس فیصلے سے ایک نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً 1800 ق م کے بعد آسمانی ہدایت اور کتب کا سلسلہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں مختص ہو گیا لہٰذا ـــــــــــ دنیا کے عام طور پر اس وقت کے تہذیبی مراکز میں آسمانی ہدایت کا سلسلہ رُک گیا جس سے ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں ایک طرح کا ـــــــــــ ایک صحیح، متوازن اور فطرت انسانی سے مطابقت رکھنے والے فکر ـــــــــــ کا فقدان ہو گیا۔

انسان میں باغیانہ خیالات اور احکام خداوندی اور اطاعت رسول کی پابندیوں سے گریز کا مادہ تو ہے ہی، آسمانی وحی کے اس خلا نے 'باغی' فکر کے پنپنے اور پھیلنے کے مواقع فراہم کر دیے اور اس فکر کے ایک تن آور درخت بننے کا راستہ صاف ہو گیا۔

سابقہ انبیاء و رسل علیہم السلام کی تعلیمات کے اثرات کچھ عرصہ قائم رہے اور اہل حق اور ان انبیاء کرام علیہم السلام کے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین نے حق کا علم بلند کیے رکھا مگر تا بکے ـــــــــــ دنیا کے عظیم حصے میں انسانی فکر کے سفلی پہلو اور ابلیسی طرز فکر کو منظّم ہو کر با قاعدہ فلسفہ ہائے حیات کے طور پر سامنے لا کر حکومتوں اور سلطنتوں کی بنیادیں رکھنے کے لئے ایسی فکر کے حامل افراد میدان عمل میں کود گئے۔

چنانچہ ـــــــــــ یہی وہ دور ہے کہ انسانی فکر کے بے شمار گوشے اور درجے با قاعدہ ایک منظّم فکر اور طرز زندگی کے طور پر سامنے آتے چلے گئے۔ چین، ہند، ایران، اور یونان میں کئی صدیوں کے تعامل سے اس خدا ناشناس، خدا بیزار، اور آسمانی وحی و ہدایت کے انکار پر مبنی سینکڑوں نہیں ہزاروں فلاسفہ یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے جو اسی رخ پر بے لگام آگے بڑھتے چلے گئے اور چونکہ ان علاقوں میں کوئی آسمانی ہدایت یا آسمانی کتاب موجود ہی نہیں تھی لہٰذا ـــــــــــ ان فلسفوں کو پرکھنے کے لئے (انسانی مزاج کی آوارگی اور بے اعتدالی کے

ماحول میں) کوئی ریفرنس (REFERENCE) موجود ہی نہیں تھا۔ صاحب ثروت اور آسودہ حال طبقات' عیاشی اور بدمعاشی، ظلم، لوٹ کھسوٹ تو چاہتے ہی ہیں ایسی تعلیمات ان کو پسند آئیں اور انہوں نے اختیار کر لیں اور سلطنتوں کی بنیاد رکھ دی کچھ لوگوں نے اسی مقتدر طبقہ کے مزاج کو پہچان کر ایسے فلسفے بھی تراش دیے جو اس طبقہ اُمراء اور عوام دونوں کے دل کو بھاتے تھے چنانچہ بے حیائی، بدکاری، ناچ گانا، بے پردگی، آزادروی، اباحیت، عورت و مرد کا آزادانہ اختلاط جیسے نظریات کے حامل فلسفہ ہائے حیات فروغ پذیر ہوئے اور پھیلتے چلے گئے۔

انسانی معاشروں میں گمراہی پہلے ہی تھی مگر وہ ابتدائی مراحل کی تھی مگر اس دور میں مشرق وسطی اور جزیرہ نمائے عرب کے علاوہ پوری دنیا میں یہ خدابیزاری اور خدانا شناسی کے نظریات نہ صرف عام ہو گئے بلکہ جدید فلسفہ ہائے حیات قرار پائے۔

انسان کے جیسے بھی نظریات ہوتے ہیں ـــــ سوچ اور فکر کے زاویے ہوتے ہیں جو ذہنی تصورات ہوتے ہیں انہیں پر آگے چل کر تہذیب و تمدن کی بنیاد پڑتی ہے، اس قوم کے شعراء انہیں مضامین پر طبع آزمائی کرتے ہیں اسی طرح کے کھیل کود اور تفریح طبع کے ذرائع عام ہوتے ہیں اور تعمیرات کے میدان اسی طرح کے آرٹ اور سنگ تراشی کے نمونے سامنے آتے ہیں ان نظریات کے سامنے آنے سے اس فکری انحراف میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ ابتدائی فلاسفہ میں کوئی GOD کا قائل ہے تو وہ ساتھ شرک کا بھی تصور رکھتا ہے تاہم ایک دو نسلوں بعد خدا کے تعطل کا فلسفہ سامنے آیا اور پھر سرے سے خدا کے انکار کا نظریہ وجود میں آ گیا۔ لہٰذا ـــــــــــ حضرت مسیح علیہ السلام کا زمانہ آنے تک اور اس کے بعد دنیا میں اس انسانی بے راہ روی کی سوچ کے تحت آزاد خیالی، اباحیت پسندی، ناچ گانا، بے حیائی، بدکاری، شراب وغیرہ کے تصورات اعلیٰ زندگی کا حصہ قرار پا کر باقاعدہ فلسفے بن چکے تھے۔ بادشاہ پہلے بھی ظالم، بے تحاشا ٹیکس لینے والے، عیاش اور بے حیائی کے رسیا تھے اور ان کے اعلیٰ سرکاری عہدیدار بھی اور درجہ بدرجہ تمام سرکاری اہل کار۔ لہٰذا یہ فلسفے فروغ پذیر ہوئے اور رفتہ رفتہ آسمانی ہدایت کا تذکرہ بھی انسانی معاشروں سے ختم ہو گیا۔ چنانچہ ـــــــــــ یونان ہو یا وسطی یورپ، فارس ہو یا ہند ہر طرف مذہب کی جگہ عریانی فحاشی نے لے لی تھی اور مذہبی طبقہ برائے نام مذہب سے وابستہ تھا بھی تو مذہب کے نام

پر بھی بت پرستی تھی اور تمام بت ننگے انسانوں کی شکل میں تراشے جاتے تھے جس سے بے حیائی کے علاوہ کوئی چیز فروغ نہیں پا سکتی۔

ہند کے بت خانے شاید دنیا بھر میں بے حیائی میں سب سے آگے اور سوچ میں سب سے گھٹیا ہیں کہ مذہبی مقامات پر بھی ایسے مناظر کے سنگ تراشی کے نمونے لگائے گئے اور ہزاروں کی تعداد میں سجائے گئے ہیں کہ انسانیت شرم سے سر جھکا لے اور کوئی باضمیر انسان خود بھی ان کا مشاہدہ نہ کر سکے کجا یہ کہ اپنے بیوی بچوں بچیوں کے ہمراہ ان مذہبی مقامات کی 'یاترا' کرنے جائے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

یونان کے تہذیبی مراکز بھی اسی طرح تھے ان کے شہروں، چوکوں چوراہوں، پارکوں میں ننگ انسانیت مناظر کے بت تراشی کے نمونے آج بھی ان کی پست ذہنیت، ابلیسی سوچ اور خدا بیزاری کے نظریات کی گواہی دیتے ہیں۔

یہی بارہ صدیاں وہ دور نامسعود ہے جس کے دوران تاریخ میں فلسفہ کے ایسے نامور فلسفی سامنے آئے جو آج بھی فلسفہ کے امام مانے جاتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے پہلے پہل منفی انسانی رویوں کو 'اصل فطرت' قرار دے کر ایسے فکری دھاروں کی داغ بیل ڈالی جو بعد والوں کے لئے دلیل بھی بنی اور مزید گمراہی کا سبب بھی۔ چنانچہ ہند میں بدھ مت سمیت سارے فلسفیانہ مکاتب فکر کی بنیادیں اسی دور میں پڑیں. ایران میں زرتشت، مانی اور مزدکی فلسفوں کا دور بھی یہی ہے اور یونان کے بقراط، سقراط، افلاطون اور ارسطو اسی دور کے اساتذہ اور امام ہیں۔ یہ بات مشرق و مغرب کے تمام مراکز فکر میں مشترک ہے کہ ابتداء میں ان فلسفوں میں مذہب کا عنصر غالب تھا جب کہ آہستہ آہستہ بعد کے فلاسفہ نے اس سے بیزاری اور دوری اختیار کر لی اور 'آزادروی' اور 'من مانی' کرنے کے رویہ کو فلسفیانہ بنیادیں فراہم کر دیں۔

یہی فلسفے ــــــــــــ بعد میں بے حیائی، عریانی، فحاشی اور لامقصدیت سے ہوتے ہوئے لاادریت اور بالآخر انسان کے بس حیوان ہونے اور حیوانی خواہشات کی تکمیل ہی کو آخری انسانی مطمع نظر قرار دے کر معراج انسانیت سمجھنے لگ گئے۔ فیا اسفا۔

بنی اسرائیل یعنی ZOINIST کا کردار

اس طویل ــــــــــــ تمہید کے بعد اب قارئین بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ آسمانی وحی کے فقدان اور خلا کے ماحول میں ساری دنیا میں سامنے آنے والے ان غیر فطری فلسفوں کے اس ماحول میں بنی اسرائیل نے کیا کردار ادا کیا۔ ساری دنیا نہ سہی کم از کم مشرق وسطی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بنی اسرائیل کو آسمانی وحی کا علم بردار بن کھڑا ہونا چاہیے تھا تاکہ گمراہی اور فکری ظلمت کا فور ہو جائے تاہم بنی اسرائیل کے اس بگڑے گروہ نے اپنا مثبت کردار تو کیا ادا کرنا تھا اس ماحول میں آگے بڑھ کر دو طرح سے منفی کردار ادا کیا۔

1۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اولادِ ابراہیم سے باہر کی دنیا میں نبوت و وحی کے انقطاع کے نتیجے سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں، ZOINIST نام کے اس بگڑے ہوئے گروہ نے اپنے طرز عمل سے اس سوچ کے لئے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اس کے مواقع فراہم کیے۔ یعنی اس ابلیسی گروہ نے اپنے ہاں کے نبیوں کی تعلیمات سے، پہلے درجے میں گریز کیا پھر انکار کیا نتیجتاً مخالفت پر اتر آئے اور بالآخر......قتل انبیاء علیہم السلام جیسے جرم کے مرتکب ہو بیٹھے اور ایک دفعہ غلطی نہیں کی بلکہ سینکڑوں نبی قتل کر دیے اور اپنے اس شیطانی طرز عمل کے لئے سو بہانے تراش لیے اور اسی بنیاد پر مختلف فلسفہ ہائے حیات گھڑ لیے اور ان کی خوش فہمی یہ تھی کہ اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہو گی۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:(05-70-71)

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝ وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ

’’ہم نے بنی اسرائیل سے عہد بھی لیا اور ان کی طرف پیغمبر بھی بھیجے (لیکن) جب کوئی پیغمبر ان کے پاس ایسی باتیں لے کر آتا جن کو ان کے دل نہیں چاہتے تھے تو وہ ان (انبیاء و رسل علیہم السلام) میں سے بعض کو مسلسل جھٹلاتے رہے اور بعض کو قتل کرتے رہے اور یہ خیال کرتے تھے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آئے گی، تو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے

پھر بھی اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی (لیکن) پھر ان میں سے بہت سے
اندھے اور بہرے ہو گئے۔ اور اللہ ان کے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے"۔

عام انسان کا قتل بہت بڑا جرم ہے کسی سرکاری اہل کار کا اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران قتل، عام قتل سے کہیں بڑا جرم ہے تو آسمانی بادشاہت کے نمائندے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا قتل کتنا بڑا جرم ہے اس کا اندازہ کوئی صاحب دل اور باضمیر انسان ہی کر سکتا ہے۔ جبکہ ـــــــــــ بنی اسرائیل میں ابلیسی سوچ کا حامل یہ گروہ اس کام کو کرتا رہا اور ساتھ یہ بھی سمجھتا رہا کہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں بنے گا۔ اعاذنا اللہ من ذالک

بنی اسرائیل کی طرف سے قتل انبیاء علیہم السلام کے اس جرم نے (جبکہ باقی دنیا میں آسمانی ہدایت کے فقدان کے نتیجے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور روشنی صرف بنی اسرائیل کے پاس تھی) گمراہی کی ظلمت میں اضافہ کر دیا اور یوں ساری دنیا خدا ناشناسی اور خدا بیزاری کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں آ گئی یا بالفاظ دیگر انسانی سوچ کو روشنی دکھانے والا ذریعہ ہی گرہن کی زد میں آ گیا۔ دنیا میں وحی و نبوت کا ایک انقطاع اولاد ابراہیمؑ میں وحی و نبوت مختص ہونے کی وجہ سے ہو گیا۔ جبکہ قتل انبیاء بھی نتیجے کے اعتبار سے انقطاعِ وحی و نبوت ہی بن گیا۔ اگرچہ یہ انقطاع مصنوعی اور انسانوں کا خود پیدا کردہ تھا۔

بنی اسرائیل کے اس جرم نے پوری دنیا سے ہدایت کی روشنی کو غائب کر دیا ـــــــــــ قتل انبیاء کرام دراصل آسمانی احکام کو سامنے آنے سے روکنے کے لئے تھا۔ چنانچہ اس جرم کے دوسرے مرحلے کے طور پر سابقہ وحی اور آسمانی کتب تورات اور زبور کو صفحۂ ہستی سے بالارادہ غائب کر دیا گیا تاکہ دنیا میں نہ کوئی آئینہ ہو گا نہ بنی اسرئیل کے اس ابلیسی گروہ کا مکروہ چہرہ کوئی دیکھ سکے گا۔ اس عمل سے مشرق وسطی اور آس پاس کے علاقوں میں بھی آسمانی ہدایت اور وحی سے آزاد انسانی سوچ اور رویوں کو آگے آنے کا موقع مل گیا گویا جو کچھ ہند، ایران اور یونان میں پرورش پا رہا تھا اسی طرز فکر کے عام کرنے کے مواقع بنی اسرائیل کے اس ابلیسی گروہ نے یہاں بھی فراہم کر دیے۔

2۔ قتل انبیاء علیہم السلام کے جرم کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے اس بگڑے ہوئے گروہ نے آگے بڑھ کر ایسے نظریات وافکار کی نہ صرف آبیاری کی بلکہ سرپرستی کر کے آگے بھی بڑھایا جو خود ساختہ انسانی نظریات تھے۔ سرپرستی کرنے کے اس عمل سے بنی اسرائیل کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ ضرورت پڑنے پر اپنی مرضی کے نظریات بھی سامنے لا سکتے تھے اور فروغ دے سکتے تھے۔

☆ اس دوران 300 ق م کے لگ بھگ بنی اسرائیل کے ایک صالح گروہ کی قیادت میں مکابی سلطنت کا قیام عمل میں آ گیا، ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر ہوگئی اور وسیع علاقے پر آسمانی بادشاہت قائم ہوگئی اس کے باوجود اس ابلیسی گروہ کی سوچ میں تبدیلی نہ آئی۔ بالآخر شمال سے پہلے چھوٹے چھوٹے حملے آور آئے اور مکابی سلطنت ختم ہوگئی، یہ علاقے داخلی خودمختاری کے ساتھ رومی سلطنت کے ماتحت آ گئے۔ اس دنیاوی ذلت اور ایک درجے کی غلامی کے باوجود اس گروہ نے اپنی مکروہ کاروائیوں میں کمی نہیں آنے دی۔ اس لئے کہ یہ ابلیسی گروہ اب پل بڑھ کر جوان ہو چکا تھا اور خوب منظم بھی۔ خفیہ طور پر فری میسن تحریک اور دوسرے گروپس مختلف انداز میں سرگرم تھے اور اپنے مکروہ ابلیسی عزائم کو آگے بڑھا کر دنیا کو اور انسانیت کو اشرف المخلوقات کے مقام سے گرا دینا چاہتے تھے۔ یہی وہ چیلنج ہے جو ابلیس نے تخلیق آدم کے وقت حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا تھا۔

☆ بنی اسرائیل کے اس گروہ نے اپنے عزائم کے لئے اتنی زبردست تیاری کر رکھی تھی، حد درجہ منظم انداز میں آگے بڑھ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ اور اس کی مشیت کے مقابلے میں اتنے جری ہو گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسرائیلی حکومت کے خاتمے اور غلامی کے عذاب سے بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں اور انہیں اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا۔ تا آنکہ اس دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر جوانی تک اور آغاز وحی سے لے کر رفع آسمانی تک ساری زندگی ہی معجزہ تھی۔ یہود خود بھی بحیثیت مجموعی ایک آسمانی نجات دہندہ کے منتظر تھے مگر حضرت مسیح علیہ السلام نے چونکہ بقول قرآن مجید یہود پر سخت تنقیدیں کیں (اور موجودہ اناجیل بالخصوص متی کی انجیل میں پہاڑی کا وعظ بھی اسی کی گواہی دے رہا ہے) جس کی وجہ سے یہود حضرت مسیح علیہ السلام کے سخت مخالف ہو گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام یہودی افکار، نظریات اور بدعملی پر

جتنی تنقید کرتے تھے نشتر لگاتے تھے کہ شاید گندہ مواد نکل آئے اور بنی اسرائیل راہ راست پر آجائیں۔ بنی اسرائیل اس ابلیسی گروہ (ZOINIST) کے زیر اثر اتنے زیادہ حضرت مسیح علیہ السلام کے مخالف ہوتے گئے حتیٰ کہ ان کی جان کے درپے ہو گئے۔

بنی اسرائیل کا یہ ابلیسی گروہ قتل انبیاء علیہم السلام میں اتنا جری ہو چکا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تنقیدوں سے پریشان ہو کر اس گروہ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بھی قتل کا منصوبہ بنا دیا۔ انہوں نے ایک ایسا مکمل منظّم منصوبہ بنایا کہ اس میں اپنی طرف سے کوئی جھول نہیں رہنے دیا تاہم قرآن مجید بتا رہا ہے (21-58) کہ نبی تو قتل بھی ہو گئے لیکن رسول قتل تو درکنار دشمن کے کبھی ہاتھ بھی نہیں آئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے جلیل القدر رسول تھے لہٰذا ''تدبیر کنند بندہ......تقدیر کنند خندہ'' کے مصداق اس اسرائیلی ابلیسی گروہ کے منظّم منصوبے کے باوصف اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو زندہ ہی اُٹھا لیا اور انؑ کی جگہ ان کی مخبری کرنے والا ان کا ایک حواری گرفتار ہو کر سولی چڑھ گیا۔ (انجیل برناباس)

اس ابلیسی گروہ کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی کی سزا دلوائی یا قتل کرا دیے ہیں۔ آج کے 99% عیسائی بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں جبکہ قرآن مجید ان کے اس زعم کو باطل قرار دیتا ہے اور علی الاعلان کہتا ہے:

وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ

''اور انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا اور نہ سولی چڑھایا''

وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (157-05)

''بلکہ ان کو ان کی سی صورت معلوم ہوئی''

بنی اسرائیل خود اپنی کتابوں کی پیشینگوئیوں کے مطابق ایک نجات دہندہ کے منتظر تھے حضرت مسیح علیہ السلام تشریف لائے تو نہ صرف انکار و تکذیب کی بلکہ ———— اپنے زعم میں تو انہیں سولی چڑھا دیا (تفاصیل کیلئے دیکھیں انجیل برناباس) اس لئے بنی اسرائیل کا یہ ابلیسی گروہ آج بھی اصلی 'مسیح' کے انتظار میں ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عنقریب وہ اصفہان سے ظاہر ہوگا۔ (یہ تفصیل ہم اصفہان نامی مضمون ماہ فروری 10ء کے حکمت بالغہ میں شائع کر چکے ہیں جن حضرات کو دلچسپی ہو وہاں ملاحظہ فرمالیں)۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع آسمانی سے اس ابلیسی گروہ کیلئے ساری دنیا میں خدا بیزار،

خدانا شناس نظریات کو عام کرنے اور دوسرے علاقوں میں موجود ایسے نظریات کی سرپرستی کر کے پروان چڑھانے کا سنہری موقع ہاتھ آ گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام پر یہود کی دست درازی اور انکار پر اللہ تعالیٰ نے عذاب کے طور پر ٹائٹس رومی (70ء) کے ذریعے بیت المقدس کو تباہ کروادیا۔ بیت المقدس دوبارہ مسمار کر دیا گیا اور یہود کو مستقل طور پر بیت المقدس سے نکال دیا گیا۔ 70ء کے اس انخلاء کے بعد بنی اسرائیل (ابلیسی گروہ) کے ایک دورِ انتشار (DIASPORRA) کا آغاز ہوتا ہے جس کے تحت وہ ساری دنیا میں جہاں مواقع ملے چلے گئے اور آباد ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے وحی و نبوت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں بظاہر اس لئے مختص فرمائی تھی کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں انسانوں میں سے ایک باصلاحیت، باضمیر، خداشناس اور اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں و رسولوں علیہم السلام کا وفادار گروہ پروان چڑھے اور ان کے زیر اثر نسل انسانی کا ایک بڑا حصہ حق پرستی و حق شناسی کی راہ ''صراطِ مستقیم'' پر گامزن ہو مگر شیطان بھی ہر انسان کے ساتھ ہے اور اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کر کے جو جرم کیا تھا اور جس جرم پر معافی مانگنے کی بجائے ڈٹ گیا اور دلائل سے ثابت کرنے لگا کہ آدم مجھ سے کمتر ہے میں اُسے کیوں سجدہ کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو دھتکار دیا۔ اس نے قیامت تک کی مہلت عمر مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ کہا تھا کہ اب میں اس انسان کے آگے، پیچھے اور دائیں بائیں سے حملہ آور ہو کر اسے گمراہ کروں گا اور ثابت کروں گا کہ یہ ابن آدم مجھ سے بہتر نہیں ہے۔

یہی چیلنج اور معرکہ خیر و شر ہے جو دنیا میں جاری ہے جہاں خیر کے مواقع زیادہ ہوں اور انسانوں کی بھلائی اور راہ راست پر آنے سے ابلیسی منصوبوں کی ناکامی کا خطرہ ہو ابلیس اور اس کے اہل کار (جنوں اور انسانوں میں سے) وہیں خاص مورچہ لگاتے ہیں۔ بنی اسرائیل جن میں حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف علیہم السلام کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر بے شمار پیغمبر آئے مگر یہ گروہ روز اول سے حق سے گریز، تعلیمات انبیاء سے روگردانی اور خیر سے نفرت کے رویے اپنا کر ابلیس کا نمائندہ بن گیا اور آج بھی ہے۔ کجا یہ بنی اسرائیل حق کے علمبردار بنتے جبکہ اہل حق قلیل تھے اور اہل شر غالب تھے مجموعی طور پر تاریخ انسانی میں بنی اسرائیل کا یہ بگڑا

ہوا گروہ یہود، شیطان کا نمائندہ اور ابلیسی منصوبوں کا پرچارک تھا بلکہ ابلیس کا فرنٹ مین بن گیا۔

33ء سے 610ء تک فترۃ وحی

حضرت مسیح علیہ السلام تک بنی اسرائیل نے اپنی قوم میں سے اُٹھنے والے سینکڑوں پیغمبر قتل کر دیے اور یوں حق کی آواز کو دبانے کی کوشش کی۔ اولادِ ابراہیم سے باہر وحی و نبوت کے انقطاع اور اولادِ ابراہیمؑ میں قتل انبیاء کے گھناؤنے جرم اور تورات و زبور کی گمشدگی سے آسمانی ہدایت کے انسانوں تک پہنچنے میں ایک مصنوعی خلا پیدا ہو گیا ــــــــــــ ادھر مشیت ایزدی بھی انسان کو آزماتی ہے بلکہ جیسا مزاج بن جائے اسی طرح کے مواقع پیدا کر کے اتمام حجت کر دیتی ہے حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ تشریف لانے والے تھے جس کے بعد ویسے ہی ختم نبوت و رسالت ہونے والی تھی؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ختم نبوت سے پہلے حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کے درمیان چھ صدیوں کا وقفہ آ گیا۔

اس طرح حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل کی چھ صدیاں مصنوعی انقطاعِ ہدایت اور بعد کی چھ صدیاں مشیت ایزدی میں فترۃ الوحی اور 'نبی آخرالزمان' کے لئے انتظار کی صدیاں بن گئیں۔ اہل حق کے لئے تو یہ صدیاں کسی خصوصی مہمان کی آمد کے انتظار کی صدیاں تھیں جس میں 'مہمان خصوصی' کی آمد کی فرحت انتظار کے کرب کو دبائے ہوئے تھی۔ مگر ــــــــــــ بنی اسرائیل کے اس بگڑے ہوئے گروہ کے لئے یہ چھ صدیاں دنیا میں گمراہی پھیلانے کے ابلیسی منصوبے کو اقصائے عالم میں عام کرنے اور انسانیت کو شرف انسانیت سے گرا کر حیوانیت اور خود پرستی کے قعر مذلت میں گرانے کے عمل کی صدیاں ثابت ہوئیں۔

حضرت محمد ﷺ کی پیدائش 571ء اور آغاز وحی 610ء کا ہے۔ ان شاءاللہ
اگلے شمارے میں اس بحث کا دوسرا حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے

خودی اور ذکر

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

کی کتاب ''حکمت اقبال'' سے ایک باب

ذکر۔خودی کی ایک بنیادی ضرورت

خودی حق تعالیٰ کی صفات کے حسن وکمال پر غور وفکر کر کے اپنے جذبہ حسن کو مطمئن کرنے کے لئے مظاہر قدرت کو ہی نہیں بلکہ لغت کے ان الفاظ کو بھی خدا کی صفات کی علامات کے طور پر کام میں لاتی ہے جو خدا کی صفات کے لئے مستعمل ہیں۔قرآن حکیم نے ان الفاظ کو 'اسماءِ حسنیٰ' یعنی حسین نام کہا ہے۔

بندہ مؤمن ان الفاظ کے مفہوم کو ذہن میں رکھ کر زبان اور دل سے بار بار ان کا اعادہ کرتا ہے اور اس عمل کے دوران اپنی توجہ اس حسن وکمال پر مرتکز کرتا ہے جس کا یہ مفہوم آئینہ دار ہوتا ہے۔لہٰذا وہ اس طریق سے حسن کے باطنی مشاہدہ اور مطالعہ سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اس کی ثروت اور گہرائی سے آشنا ہوتا ہے۔جستجوئے حسن کی اس شکل کو ذکر یا عبادت کہا جاتا ہے' اگرچہ لفظ عبادت کا مفہوم وسیع ہے اور انسان کی زندگی کے تمام اعمال کو عبادت میں شمار کیا جاتا ہے لیکن محدود معنوں میں عبادت کی اصطلاح ذکر کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بھی برتی جاتی ہے۔ذکر انسان میں محبت کا سوز بڑھاتا ہے یہاں تک کہ اس سوز سے وہ شعلہ کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔مسلمانوں کو ایک ایسے مرد خدا کی ضرورت ہے جس کے دل میں کثرت ذکر سے خدا کی محبت کا شعلہ روشن ہو گیا ہو اور جس کا ذہن فکر کی سرعت میں بجلی سے بھی زیادہ تیز ہو۔پھر وہ دنیا کو خدا کی مرضی کے مطابق بدلنے کے لئے ایک قیامت برپا کرسکتا ہے۔؎

اے حلقہ درویشاں وہ مرد خدا کیسا ہو جس کے گریبان میں ہنگامہ رستاخیز
جو ذکر کی گرمی سے شعلہ کی طرح روشن جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

آدھی رات کے بعد سے لے کر صبح تک ذکر میں مشغول ہونا جس کی تحسین قرآن حکیم نے ''تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ'' کے الفاظ سے کی ہے خودی کے مقصد کے لئے زیادہ مفید اور مؤثر ہوتا ہے کیونکہ اس وقت خاموشی اور تنہائی اور خدا کی خاص رحمت کے نزول کی

وجہ سے خودی ذکر پر اپنی توجہ زیادہ آسانی سے مرکوز کر سکتی ہے۔ جذبہ محبت خودی کو پارہ کی طرح بے قرار رکھتا ہے لیکن ذکر نیم شبی اس کو اس طرح سے قرار اور جمعیت خاطر بخشتا ہے جس طرح چوب عود پارہ کو ساکن کر دیتی ہے۔

؎ بذکر نیم شب جمعیت او چون سیماب کہ بندد چوب عودش

گویا ذکر یا عبادت کوئی لسانی یا صوتی مشق نہیں بلکہ خودی یا روح کی ایک داخلی جدوجہد ہے جو حسن کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حسن کا قریبی مشاہدہ کر کے اس احساس کو اور گہرا کیا جائے یہاں تک کہ انسان کی محبت اپنے کمال کو پہنچے۔ وہی ذکر محبت کی پوری نشوونما کر سکتا ہے جو حسن کے سچے احساس سے پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے کلام میں بار بار ذکر اور عبادت کے اخلاص پر بڑا زور دیا ہے۔

؎ لا اِلٰہ گوئی بگواز روئے جان نازاندام تو آید بوئے جان

؎ تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لَا اِلٰــــہَ اِلَّا
لغت غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

صدف ایمان کا گوہر

چونکہ مخلصانہ ذکر سے رفتہ رفتہ غیر اللہ کی محبت گھٹتی اور اللہ کی محبت بڑھتی جاتی ہے اس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مومن کے لئے بے حیائی اور نافرمانی کا ارتکاب غیر ممکن ہو جاتا ہے اس لئے اسلام میں ذکر کی ایک خاص اقل قلیل صورت جو حضور ﷺ کے ارشاد اور عمل سے معین ہوتی ہے اور جسے صلاۃ یا نماز کہا جاتا ہے' ہر مسلمان پر لازم قرار دی جاتی ہے۔ نماز وہ گوہر ہے جو ایمان کے صدف میں پرورش پاتا ہے اور اس لحاظ سے مؤمن کا گویا چھوٹا حج ہے کہ اس میں مومن قلبی اور ذہنی طور پر بیت اللہ کا طواف کرتا ہے، نماز مسلمان کے ہاتھ میں ایک خنجر کی طرح ہے جو بے حیائی، بداخلاقی اور نافرمانی کا قلع قمع کرتی ہے۔

؎ لا الہ باشد صدف گوہر نماز قلب مسلم راحج اصغر نماز
درکف مسلم مثال خنجر است قاتل فحشاء وبغی ومنکر است

لیکن نماز مؤمن کے لئے صرف اتنے ہی ذکر کا اہتمام کرتی ہے جو ذکر سے اس کی محبت پیدا کرنے

اور مخلصانہ ذکر کی عادت کو راسخ کرنے کے لئے کم از کم درکار ہے۔اس کے ذریعہ سے مؤمن کی خودی کو ذکر کی وہ تمام غذا میسر نہیں آتی جو اس کی اشتہائے حسن کو پوری طرح مطمئن کر کے اس کی پوری پوری نشو ونما کر سکتی ہو۔لہٰذا قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ مؤمن نماز کے بعد بھی کثرت سے خدا کا ذکر کرتا رہے۔نماز میں بھی احساس حسن (جسے اقبال جذب اندروں کہتا ہے) نہ ہو تو نماز کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔اقبال کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان میں یہی احساس حسن یا خدا کی مخلصانہ محبت کا جذبہ باقی نہیں رہا آج اگر ہم ان کی نماز کو دیکھیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ نہ تو صفیں ذوق وشوق کے ساتھ درست کی ہوئی ہیں، نہ دل نماز پر جما ہوا ہے اور نہ ہی سجدہ میں کوئی لذت محسوس کی جا رہی ہے اس لئے کہ دلوں میں خدا کی محبت باقی نہیں رہی۔

ؔ صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے
ؔ وہ سجدہ روح زمین جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذان میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشہ سیماب
ؔ تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ

اقبال کو شکایت ہے کہ خدا کی سچی محبت کی طرف بلانے والے اب نہ مسجدوں میں ہیں نہ خانقاہوں میں اور نہ مدرسوں میں اور اب تنہا وہی ہے جو اس کی طرف سب کو دعوت دے رہا ہے۔صوفیوں اور معلّموں کے کدو خدا کی محبت کی خالص شراب سے خالی ہیں اب اگر یہ شراب ناب کہیں ملتی ہے تو اقبال کے سبوچہ میں۔

ؔ میرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانہ میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو
ؔ مرے کدو کو غنیمت سمجھ کر بادہ ناب

نہ مدرسہ میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

ے جلوتیاں مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیاں میکدہ کم طلب و تہی کدو

احساس حسن یا جذب اندرون یا خدا کی محبت ہی ایمان ہے' یہی دل کے مسلمان ہونے کی علامت ہے کوئی مسلمان ہو یہ بات کہنے والا ہو یا سننے والا ہو جب تک اس کا دل مسلمان نہ ہوگا اس وقت تک اس کی نماز بے فائدہ رہے گی' آج مسلمان کا دل مسلمان نہیں ہے لہٰذا اس کی نماز بے نتیجہ ہے

ے دل ہے مسلمان میرا نہ تیرا' میں بھی نمازی تو بھی نمازی

جذب مسلمانی

اس احساس حسن کو اقبال جذب مسلمانی بھی کہتا ہے کیونکہ یہ مسلمان کا خاص امتیاز ہے اور اسے شرع مسلمانی سے ممیّز کرتا ہے۔ شرع مسلمانی تو یہ ہے کہ مسلمان نماز کو اس کے ظاہری آداب کے ساتھ ادا کر دے اور جذب مسلمانی یہ ہے کہ مسلمان جب نماز ادا کرے تو خدا کے حسن و کمال کا سچا احساس یا عشق اس کی نماز کا رفیق ہو یہی احساس حسن یا جذب مسلمانی اقبال کے نزدیک سر کائنات ہے کیونکہ اسی کی خاطر کائنات پیدا کی گئی ہے اور یہی انسان اور کائنات کو معراج کمال پر پہنچانے کا ذریعہ بننے والا ہے۔ یہی مومن کے تمام اعمال و افعال کی قوت محرکہ ہے جس کے بغیر مومن کے لئے صحیح قسم کے عمل کی راہ پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وہ چیز ہے جو یقین یا ایمان کی شاخ کو زندہ سبز یا نمناک رکھتی ہے۔

ے اک شرع مسلمانی اک جذب مسلمانی
ہے جذب مسلمانی سر فلک الافلاک
بے جذب مسلمانی اے رہرو فرزانہ
نے راہ عمل پیدا نے شاخ یقین نمناک

شریعت اسی احساس حسن یا عشق یا خدا کی محبت کے اظہار کے معین طریقوں کا نام ہے۔ اگر احساس حسن یا عشق مفقود ہو تو نماز ہی نہیں بلکہ ساری شریعت ایسے تصورات کا ایک مجموعہ بن جاتی ہے جن کا مقصد خدا طلبی یا خدا شناسی نہیں ہوتا بلکہ جو خدا کی بجائے خود مطلوب اور معبود بن

جاتے ہیں اور لہذا بتوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

عقل و دل نگاہ کا مرشد اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدہ تصورات

اقبال ذکر کو کبھی آہِ سحر گاہی کہتا ہے اور کبھی فغانِ صبحگاہی اور کبھی آدابِ سحر خیزی کا نام دیتا ہے۔ جب تک انسان غیر اللہ کی محبت میں گرفتار رہتا ہے وہ اپنی آرزوئے حسن کی مکمل تشفی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ آرزو سوائے خدا کے اور کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوتی اس وقت تک نہ تو اس کی شخصیت اپنے کمال کو پاتی ہے اور نہ ہی وہ مکمل طور پر اطمینان قلب سے بہرہ ور ہو سکتا ہے لیکن انسان ذکر کے بغیر خدا کی محبت کا وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا جہاں وہ غیر اللہ کی محبت سے بے نیاز ہو جائے۔

ے نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی ہوئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغان صبح گاہی
امان شاید ملے اللہ ھُو میں

ے عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے خود بھی ذکر نیم شبی کو اپنا شعار بنایا جس کو لندن کے جاڑے کی نہایت سرد ہوا بھی ترک نہ کروا سکی۔

زمستانی ہوا میں گو کہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹا مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

ذکر کے بغیر فکر نہ کامل ہوتا ہے اور نہ اپنے مقصد کو پا سکتا ہے۔ ذکر اور فکر کو ساتھ ساتھ رہنا چاہیے۔

ے فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر

خودی کے خواص

ذکر اور نماز اور اسلام کی ایسی ہی دوسری تعلیمات پر اقبال کا زور جیسا کہ اقبال کو مُلّا

کہنے والے بعض ناقدر دانوں نے سمجھا ہے اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسلام کا واعظ یا مبلغ بن کر اسلام کی ان تعلیمات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ فطرت انسانی یا انسانی خودی کے خواص کے جن ناقابل انکار حقائق کو وہ اپنی جستجو سے دریافت کر چکا ہے وہ اسے ضروری قرار دیتے ہیں اور اقبال نے جس طریق سے ان حقائق کی جستجو کی ہے وہ سائنس دان کے طریق جستجو سے چنداں مختلف نہیں۔ سائنس دان کا کام یہ ہے کہ وہ مشاہدات کے ذریعہ سے ہر چیز کے خواص معلوم کرنا چاہتا ہے لیکن بعض چیزیں دنیا میں ایسی بھی ہیں جو براہ راست کسی کے مشاہدہ میں نہیں آسکتیں اور صرف ان کے خارجی اثرات ہی مشاہدہ میں آسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی چیزوں کے خواص کا علم سائنسدانوں کو ان کے اثرات کے مشاہدہ اور مطالعہ ہی سے حاصل ہوسکتا ہے اور سائنسدان ان کا علم حاصل کرنے کے لئے بالکل یہی طریقہ اختیار کرتا ہے۔ ان چیزوں میں سے جیسا کہ میں پہلے گزارش کر چکا ہوں ایک ایٹم ہے۔ شاید آج سے دس بارہ سال پہلے ایک امریکی سائنسدان نے الیکٹرانک خوردبین سے ایٹموں کو دیکھا تھا۔ لیکن ایٹم کے خواص کے متعلق جس قدر معلومات اس وقت سائنس دانوں کو حاصل ہیں وہ تقریباً سب کی سب ایٹم کو دیکھنے سے پہلے اور اسے دیکھنے کے بغیر اس کے اثرات کے مشاہدہ سے حاصل ہوئی تھیں۔ اسی قسم کی ایک اور چیز انسانی خودی ہے جس کو ہم دیکھ نہیں سکتے تاہم اس کے اثرات سے اس کے خواص معلوم کر سکتے ہیں۔ خودی کے خواص کا علم انسان کے لئے حد درجہ ضروری ہے کیونکہ خودی ہی انسان کی اصل ہے، انسان کے تمام اعمال و افعال جن سے دنیا کے اندر ایک ہنگامہ برپا ہے' خودی کے ہی اعمال و افعال ہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ جاننا بے حد ضروری ہے کہ خودی کیا ہے اس کے خواص کیا ہیں اس کے افعال و اعمال کا منبع کیا ہے اور یہ کیا چاہتی ہے اور کیوں چاہتی ہے یہ جاننے کے بغیر ہم انسان کے اعمال و افعال کو ضبط میں نہیں لا سکتے اور نہ حسب منشا ان سے کام لے سکتے ہیں مثلاً انسان کی باہمی جنگوں اور رقابتوں کو روک نہیں سکتے اور انسانی دنیا میں امن اور صلح اور ترقی اور خوشحالی کی مکمل فضا پیدا نہیں کر سکتے اور یہ نہیں بتا سکتے کہ انسان اپنے سیاسی، قانونی، تعلیمی، اخلاقی، علمی اور فنی، جنگی، سفارتی اور اقتصادی نظامات کو کیسے قائم کرے کہ وہ پائیدار ہوں، درست ہوں اور اس کے لئے مفید ہوں اور پریشانیوں کا باعث نہ ہوں۔ اقبال نے خودی کے اثرات کو جو انسانی اعمال و

افعال کی صورت میں ہیں سامنے رکھ کر خودی کے خواص کے متعلق کچھ نتائج اخذ کیے ہیں۔ اقبال کا فلسفہ ان ہی نتائج پر مشتمل ہے۔ اقبال سے پہلے بعض اور لوگوں نے بھی خودی کے اثرات سے خودی کے خواص معلوم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اقبال کے سوائے کسی کے نتائج خودی کے اثرات کی (جو افراد اور اقوام کے ماضی اور حال کی تاریخ کے آئینہ میں آشکار نظر آ رہے ہیں) تسلی بخش تشریح نہیں کر سکتے۔ یہ نتائج نہ تو ان اثرات کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتے ہیں اور نہ ہی آپس میں اور دوسرے علمی حقائق کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ لہٰذا معقولیت اور یقین افروزی کے درجہ سے گرے ہوئے ہیں۔ اگر اقبال نے خودی کے اثرات کے مشاہدہ سے یہ بات معلوم کی ہے کہ خودی فقط خدا کی محبت کا ایک طاقتور جذبہ ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں اور خودی کے تمام اثرات اور اعمال اور افعال خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط اس کے اس جذبہ محبت سے پیدا ہوتے ہیں اور خودی کا جذبہ محبت ذکر و فکر سے تشفی پاتا ہے............تو وہ یہ بات کہنے پر مجبور ہے خواہ کوئی اسے پسند کرے یا نہ کرے۔ یہ وعظ نہیں بلکہ مشاہدات کے نہ گزیر نتائج کا اظہار ہے۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان نتائج کو صحیح طور پر اخذ کرنے میں اقبال کو اسلامی تعلیمات نے بڑی مدد دی ہے اور نہ ہی اس بات سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات سے ان نتائج کی تائید مزید ہوتی ہے اگر کوئی شخص پانی کے خواص کا مشاہدہ کر کے یہ کہے کہ وہ صفر ڈگری سنٹی گریڈ پر برف بن جاتا ہے تو خواہ وہ شخص جو برف سے نفرت کرتا ہو یا برف کے خلاف ایلرجک (ALLERGIC) ہو‘ اس بیان کو ناپسند کرے اس میں پھر بھی کوئی نقص نہیں ہوگا اور کہنے والے کو پھر بھی یہی کہنا چاہیے۔

عبادت کی اہمیت

انسان کا وہ عمل جسے خدا کی عبادت کا نام دیا جاتا ہے اور جس کا بڑا عنصر ذکر ہے‘ انسان کے تجربات میں سب سے زیادہ قیمتی اور اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اس کے ذریعہ سے انسان اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی آرزو کو اپنا صحیح اور قدرتی اظہار پانے کا موقع دیتا ہے اور اس طریق سے اس کی مکمل اور مستقل تشفی کر کے اپنی شخصیت کے ارتقاء کو نکتہ کمال پر پہنچانے کا اہتمام کرتا ہے یہ گویا انسانی خودی کا اپنے مبدأ کی طرف عود اور اپنی منزل مقصود کی طرف رجوع ہے۔ یہ دو بچھڑے ہوئے عاشقوں کی ملاقات ہے جو

کروڑہا برس کے ارتقائی عمل کی صورت اختیار کرنے والی ایک دوسرے کی طویل جستجو کے بعد ان کو میسر آتی ہے۔ اقبال ہمیں بتاتا ہے کہ عبادت ایک فطری عمل ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے سائنسدانوں کی جستجوئے صداقت کا ہی ایک تتمہ ہے۔

''عبادت کا منبع انسان کی فطرت میں ہے۔ فکر کے ذریعہ سے شعور حقیقت کے عمل کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ ذکر کے دوران یہ سست رفتاری سے منکشف ہونے والے عالمگیر اصولوں کی جستجو کی قوت کی حیثیت سے اپنا کام ترک کر دیتا ہے اور فکر سے بالا ہو کر براہ راست حقیقت کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے تاکہ اس کے کام میں ارادی طور پر شرکت کر سکے۔ اس میں کوئی مخفی یا ناقابل فہم بات نہیں۔ عبادت حصول تجلی کے ایک ذریعہ کے طور پر ایک قدرتی حیاتیاتی فعل ہے جس سے ہماری شخصیت کا چھوٹا سا جزیرہ اچانک ہی زندگی کی بڑی وحدت میں اپنا مقام دریافت کر لیتا ہے......دراصل عبادت کو قدرت کا مشاہدہ کرنے والے انسان کی جستجوئے علم کا ایک ضروری تتمہ سمجھنا چاہیے۔ قدرت کا سائنسی مشاہدہ حقیقت کے کردار کے ساتھ ہماری گہری وابستگی قائم کرتا ہے اور اس طرح سے اس کے زیادہ گہرے مطالعہ کے لئے ہمارے وجدان کو تیز تر کرتا ہے............سچ بات یہ ہے کہ علم کی ساری جستجو ہی دراصل ایک قسم کی عبادت ہے اور قدرت کا مشاہدہ کرنے والا سائنسدان ایک قسم کا جویائے حق صوفی ہے جو عبادت کر رہا ہے۔''

اگر مومن درحقیقت سچا مومن ہے تو ذکر اور تسبیح اور عبادت سے جو قوت اسے حاصل ہوتی ہے وہ اسے مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر ضائع نہیں کرتا بلکہ دنیا کو اپنے محبوب کی مرضی کے مطابق بدلنے کے لئے کام میں لاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے کہ دنیا کی کوئی چیز نہیں جو خدا کی تسبیح بیان نہیں کرتی۔ اگر انسان ذکر و تسبیح پر ہی اکتفا کرے تو اس کا درجہ جمادات اور نباتات سے بلند نہیں ہوگا جو بے شعور ہیں یا نیم شعور۔ لیکن انسان چونکہ خودشناس اور خودشعور ہے، کائنات میں اس کا اصل کردار یہ ہے کہ وہ کائنات کی تعمیر اور تکمیل میں خدا کا شریک کار بنے اور اس غرض کے لئے فقط زبان سے نہیں بلکہ اپنی مسلسل عملی جدوجہد سے نعرہ تکبیر بلند کرے۔ زبان سے ذکر اور تسبیح کرنا

اس کردار کی تیاری کے ذرائع ہیں کیونکہ ان سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو اس کردار کو مؤثر طریق پر انجام دینے کے لئے کام آتی ہے۔افسوس کہ اکثر علماء دین ذکر اور تسبیح پر زور دیتے ہیں لیکن خدا کی مرضی کے مطابق دنیا کو بدلنے پر زور نہیں دیتے۔ حالانکہ قرآن حکیم کے ارشادات کی رُو سے خدا مومنین سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی دنیا کو اس کی مرضی کے مطابق بدلنے کے لئے جدوجہد کریں اور ان سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو اس کی مدد ان کے ساتھ ہوگی۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْ کُمْ (اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہیں نصرت دے گا) خدا کی مدد یہی ہے کہ خدا کائنات کو ترقی دے کر جس کمال پر پہنچانا چاہتا ہے اس کا چاہنے والا مرد مؤمن بھی یہ کوشش کرے کہ کائنات اس کمال پر پہنچے۔اقبال نے ان حقائق کو تین زوردار شعروں میں بیان کیا ہے۔

انداز بیان گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و نباتات و جمادات

ضرور پڑھیے

والدین اوراولاد کی ذمہ داریاں

انجینئر مختار فاروقی

جناب انجینئر مختار فاروقی صاحب کا مذکورہ خطاب ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک خصوصی اجتماع میں ہوا تھا جسے ریکارڈ کر لیا گیا تھا اب آڈیو ٹیپ سے نقل کر کے افادۂ عام کے لئے قارئین حکمت بالغہ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ گفتگو میں تحریر کی بجائے تقریر کا رنگ نمایاں ہے۔(ادارہ)

الحمد لله وكفا و الصلاة والسلام على سيد الانبياء محمد المصطفى ﷺ

اما بعد: فَاَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيطٰنِ الرَّجِيم بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيم

قال تبارک وتعالیٰ: وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعبُدُوا اِلَّا اِيَّاهُ وَ بِالوَالِدَينِ اِحسَانًا (اسراء)

وقال تبارک وتعالیٰ: وَ اِذ قَالَ لُقمَانُ لِابنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ يَا بُنَيَّ لَاتُشرِك بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّركَ لَظُلمٌ عَظِيمٌ وَ وَصَّينَا الاِنسَانَ بِوَالِدَيهِ ...... (لقمان)

صدق الله عظیم

رَبِّ اشرَح لِي صَدرِي وَ يَسِّرلِي اَمرِي وَ احلُل عُقدَةً مِّن لِّسَانِي يَفقَهُوا قَولِي

حضرات! ''والدین اوراولاد کی ذمہ داریاں'' یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر قرآن وحدیث میں ہدایات بہت پھیلی ہوئی ہیں۔ جو ایک کی ذمہ داریاں ہیں وہ دوسرے کے حوالے سے بات کریں گے تو اُن کے حقوق ہیں یعنی اولاد کی جو ذمہ داریاں ہیں وہ والدین کے حقوق ہیں اولاد کو کہا جائے گا کہ یہ تمہاری ذمہ داریاں ہیں تم انہیں ادا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام میں ہر شخص کو اُس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے اور احساسِ ذمہ داری ہی ایک معقول انسان کی

نشانی ہے کہ جو آدمی عقل مند ہے اور اُس کی جسمانی صحت کے ساتھ دماغی صحت بھی قائم ہے تو اُسے خود ہی اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے ماحول میں اسی طرح ہے کہ اکثریت انسانوں کی ایسی ہے کہ کسی کو جوانی کے بعد اور شادی کے بعد کہنا نہیں پڑتا کہ بھئی خدا کا خوف کرو کچھ کماؤ کچھ گھر لاؤ کچھ کرو۔ عظیم اکثریت تقریباً 95% لوگ کماتے کھاتے ہیں انہیں بیٹھ کر بہت زیادہ سمجھانا نہیں پڑتا خود ہی احساس ہو جاتا ہے۔ بہت کم CASES ہوتے ہیں کہ اُن میں کسی کو سمجھانا پڑتا ہے پھر اُن کے بارے میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کا دماغی توازن صحیح نہیں ہے اور اس کی تربیت صحیح نہیں ہوئی ہے اس کے تو مسائل ہیں ورنہ ہر عقل منداور ذی شعور آدمی اپنی ذمہ داریوں کا شعور رکھتا ہے اور اُن کی ادائیگی کی فکر کرتا ہے۔ کچھ لوگ اگر کسی وجہ سے ذرا MENTALITY RETARTED ہیں یا انہیں احساس پیدا نہیں ہوا تو ذرا توجہ دلانے سے ہو جاتا ہے۔

تو اسی طرح ہمارے دین میں والدین کے حقوق ہیں اور اولاد کی ذمہ داریاں ہیں۔ والدین کے حقوق کا قرآن مجید بھی ذکر ہے۔ ابھی میں نے سورہ بنی اسرائیل کی ایک آیت پڑھی ہے اس کا تفصیل سے وہاں تذکرہ ہے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں ایک والد اپنی اولاد کو سمجھاتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ جیسے ابھی پروفیسر خلیل الرحمٰن صاحب نے کہا ہم عام طور پر اپنے دنیاوی ماحول کے مطابق یہی سمجھتے ہیں کہ والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ اولاد کو کھلائیں، پلائیں، ان کو جوان کریں، شادیاں کریں، تعلیم دلائیں، کاروبار سیٹ کر دیں بس ٹھیک ہے اور ہماری جو اسلامی روایات ہیں ان کے مطابق اولاد بڑھاپے میں اپنے والدین کا خیال رکھے اُن کو آرام و سہولت پہنچائے بس۔ یہ اس معاشرے کا ہمارا حال ہے جو کہ اسلامی ہے ہم مسلمان ہیں اور ہمارا معاشرہ اسلامی معاشرہ کہلاتا ہے۔ اس میں بھی ہمارا معاشرہ زوال پذیر ہے۔ آج سے 50 سال / 100 سال پہلے لوگ والدین کی جو قدر کرتے تھے اور بڑھاپے میں والدین کی جو خدمت کرتے تھے آج نہیں کرتے اور شاید جو لوگ اس وقت جوان ہیں اور کما رہے ہیں اور کھا رہے ہیں اور اُن کے بچے ابھی چھوٹے ہیں پرائمری کلاس میں پڑھتے ہیں جب وہ بڑے ہوں گے اور اُن کو اپنی اولاد سے خدمت کی ضرورت ہوگی تو شاید وہ اتنی بھی خدمت نہیں کریں گے جتنی انہوں نے کی۔ وجہ اُس کی کیا ہے؟ ایک وجہ تو صاف ظاہر ہے اور یہی اُس کی بڑی وجہ ہے کہ مغرب کی بالا دستی

ہے۔ یورپی، مغربی، امریکی، صیہونی جو بھی ذہن ہے وہ کارفرما ہے اورانہوں نے مغرب میں کچھ مخصوص حالات پیدا کر دیے ہیں اور ہم لوگ انہیں کے زیر اثر ہیں ہماری اپنی کوئی سوچ نہیں ہے اگر کوئی سوچ ہے تو بس وہ نماز روزے تک، نماز کا طریقہ اور جنازے کا طریقہ اور دفنانے کا طریقہ اور طہارت کے مسائل تک ہے اس سے آگے ہماری کوئی اجتماعی سوچ نہیں ہے۔ ہم اپنے ملک میں کوئی سوچ نافذ نہیں کر پا رہے تو دنیا کو دکھانے کے لئے ہمارے پاس کیا ہوگا۔ ہم اس وقت اندھا دھند مغربی سوچ کی پیروی کر رہے ہیں، اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ وہاں کا حال یہ ہے کہ وہاں معاشرے میں فیملی سسٹم ختم ہو چکا ہے، یورپ وامریکہ اور جو دنیا کے بڑے ممالک ہیں ان میں فیملی سسٹم نہیں ہے جب فیملی سسٹم ہی ختم ہو چکا ہے تو اولاد اور والدین کے حقوق کا کوئی تصور ہی نہیں۔ وہاں وہ شادی بیاہ کا تو بس نام ہی ہے کہ جی یہ شادی کر رہا ہے۔ مغرب میں حال یہ ہے کہ اولاد کا حق اتنا ہے کہ جب تک وہ بالغ نہ ہوں والدین ان کو کھلائیں پلائیں گے بس یہی ذمہ داری ہے، وہاں پر جیسے ہی بچہ بالغ ہوتا ہے ان ممالک میں جو ترقی یافتہ ممالک کہلاتے ہیں' والدین کو اُس سے ذرا محبت نہیں ہوتی۔ وہ اس کو LIABILITY یعنی بوجھ سمجھتے ہیں۔ وہ گنتے رہتے ہیں کہ اب یہ 17 سال ایک مہینے کا ہوگیا ہے، دو مہینے کا ہوگیا اور اب اٹھارہ سال کا ہونے والا ہے۔ ایک صاحب نے بتایا تھا کہ انگریزی کے ایک ناول میں ایک منظر دکھایا گیا تھا کہ (یورپ کے کسی گھر کا تصور کریں) اُن کی ایک بیٹی تھی اور وہ شام کے وقت پیدا ہوئی تھی اور شام کو اُس کے اٹھارہ سال ختم ہو گئے تو شام کو انہوں نے اُسے گھر سے نکال دیا کہ قانوناً اب ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے اب تم جاؤ تم LIABILITY ہو خود کماؤ کھاؤ۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے والدین اولاد سے توقع بھی نہیں کر سکتے کہ یہ اولاد بڑھاپے میں ہمارا خیال رکھے گی۔ بیٹے کو گھر سے نکال دیا جائے تو وہ تو چلو کہیں مزدوری کر لے گا، بیٹی کو نکال دیا جائے تو کیا ہوگا آپ سوچیں۔ یہی حال وہاں پچھلے چالیس پچاس سال سے ہو چکا ہے لوگ محسوس کر رہے ہیں اور ہمارے معاشرے میں جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اُسی مغربی تصور کے اثرات ہیں ہماری اولادیں کیوں نافرمان ہو رہی ہیں صاف ظاہر ہے کہ وہ وہاں کا لٹریچر پڑھ رہے ہیں، وہاں کا نصاب پڑھ رہے ہیں، وہاں کی فضا کے اثرات ہیں، وہاں کی فلمیں ہیں، وہاں کے ڈرامے ہیں، وہاں کا میڈیا ہے اور ہماری اولادیں بھی اسی

طرح رہ رہی ہیں۔ جو آج پچاس سال کی عمر میں ہیں ان میں سے ہر آدمی کو شکایت ہے کہ جتنا ہم والدین کا کہنا مانتے تھے آج ان کی اولاد ان کا کہنا نہیں مان رہی، ادب نہیں کرتی، اُن کا لحاظ نہیں کرتی۔ تو اگلی نسل میں کیا ہوگا؟ وہ آپ خود قیاس کرلیں۔ یہ اس مغربی تصور کے اثرات ہیں۔ آج کے ماحول میں یہ سوچنا کہ ہمارا مذہب کیا کہتا ہے اس کے لئے تو پہلے یہ بات ضروری ہوگی کہ ہم مذہب کو اہمیت دیں، دین کو اہمیت دیں اور صاف ظاہر ہے کہ جب دین پر بات ہوتی ہے کہ دین کیا کہتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اللہ ﷻ کیا کہتا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کیا فرماتے ہیں یہ بات آج ذہنوں سے نکلتی جارہی ہے کہ جی کھاؤ پیو عیش کرو دنیا ایسے ہی ہے ویسے ہی مولوی ڈراتے رہتے ہیں۔ یہ مغربی تصورات ہیں جو ہمارے معاشرے میں پھیل رہے ہیں۔ آزادی کا لفظ ہمارے ذہن میں ہے۔ یوم آزادی آتا ہے 14 راگست اب آنے والا ہے۔ آزادی کا لفظ بڑے بولیں گے تو اس کا مطلب ہوگا کہ ہم نے انگریز کی غلامی سے آزادی لی تھی اب ہم آزاد ہیں ہم کسی کے غلام نہیں ہم اپنے دین کے مطابق اور اپنے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق زندگی گزاریں گے یہ ہماری آزادی تصور ہوگی اور ایک جائز تصور ہے ٹھیک ہے۔ لیکن جو تصور مغرب میں ہے وہ یہ تصور نہیں ہے، وہ تصور یہ ہے کہ آزادی کا مطلب ہر قانون سے آزادی، ہر پابندی سے آزادی، یہ اللہ کے احکام ہیں چھوڑو، پابندیاں ہی پابندیاں ہیں کہ یہ کھاؤ یہ نہ کھاؤ، یہ کرو یہ نہ کرو ان کو چھوڑو...... آزادی...... جو مرضی کرو۔ اللہ و رسول کے احکام سے آزادی، والدین روکتے ہیں فلمیں نہ دیکھو اُس سے آزادی اور کوئی اخلاق ہے کوئی کردار ہے جمعہ میں مولوی صاحب روکتے ہیں یہ نہ کرو یہ نہ کرو...... جمعہ پڑھنے نہ جاؤ وہ ایسے ہی روکتے رہتے ہیں یہ کام نہ کرو یہ کام نہ کرو نہ جمعہ میں جاؤ گے نہ سنو گے نہ مسئلہ ہوگا۔ یہ جو امریکہ میں نیویارک کے قریب آزادی کا مجسمہ بنا ہوا ہے یہ وہ آزادی نہیں ہے کہ جناب ہمارا ملک آزاد ہے بلکہ وہ آزادی یہ ہے کہ امریکہ وہ ملک ہے جہاں کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ بس عیش ہے جو چاہے کرو جو چاہو کھاؤ، جو چاہو پیو، جو چاہو سنو، جو چاہو دیکھو، جو چاہو کرو بس اللہ اللہ خیر سلا۔ کوئی نہیں کہے گا کہ اللہ کا یہ حکم ہے قرآن میں یہ حکم ہے تم کیا کررہے ہو بھئی۔ کوئی کسی مذہب کے حوالے سے بات نہیں کرسکتا۔ آپ اپنا راستہ لیں جائیں جو مرضی کریں ہم اور ہیں تم اور ہو تمہیں اس سے کیا

غرض۔کوئی لباس پہنے نہ پہنے اور جو بھی کوئی انسانی پابندیاں ہوسکتی ہیں کوئی کرے یا نہ کرے کسی کو کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا۔

افسوس یہ کہ آج یہ تصورات ہمارے ذہن میں بھی آ چکے ہیں۔ہمیں والدین اوراولاد کی ذمہ داریوں پر گفتگو کرتے ہوئے پہلی بات جو ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمیں بحیثیت مسلمان ہی جینا ہے اور بحیثیت مسلمان ہی مرنا ہے اور والدین بھی مسلمان ہیں اور ہم چاہتے ہیں ہماری اولاد بھی مسلمان بن کر اٹھے۔ یہ بات اِس گفتگو کے پس پردہ ہوگی تو بات سمجھ میں آئے گی ورنہ نہیں آسکتی۔ہم مسلمان ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد بھی مسلمان ہو، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی ماننے والی ہو۔تب یہ ذمہ داریوں کی بات چلے گی ورنہ سمجھ میں نہیں آسکتی۔ورنہ تو دنیا میں پہلے ہی سے ایک سوچ موجود ہے۔دنیا میں زندگی گزارنے کے دو طریقے تو بہت عام ہیں ہر دور میں رہے ہیں آج ذرا دوسرا نمایاں ہوگیا پہلے دبا رہتا تھا۔ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ نے ہر چیز بنائی ہے انسان کو بھی بنایا ہے اور انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے تمام مخلوقات میں انسان سمجھ دار ہے۔شیر آج سے پانچ ہزار سال پہلے بھی اسی طرح رہتا تھا جیسے آج رہتا ہے۔ جنگل میں مٹی کھود کر کسی جگہ رہ لیتا ہے اور اُسی طرح شکار کر کے کھاتا ہے حالانکہ جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے۔لیکن اُس کی طرز زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا اُس کے کھانے پینے میں کوئی فرق نہیں آیا اُس نے کوئی چیز دماغ لڑا کے ایجاد نہیں کی حالانکہ بادشاہ ہے۔ نہ کوئی ڈیز سیٹ ہے نہ کوئی واٹر سیٹ ہے نہ کوئی کولر ہے نہ کوئی فریج ہے اُس کے لئے نہ کوئی قالین بچھتا ہے کہ بادشاہ سلامت ہے اس کے لئے یہ ہونا چاہیے، یہ ہونا چاہیے، جبکہ انسان .... آٹھ ہزار سال پہلے انسان بھی شاید غاروں میں رہتا تھا۔لیکن آج انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس میں عقل ہے' کہاں پہنچ گیا رہائش میں، کھانے پینے میں، سفر میں، موبائل فون ہے، ائیر کنڈیشن گھر ہے ٹرانسپورٹ ہے اور یہ ہے اور وہ ہے......انسان کہاں پہنچ گیا۔کوئی دنیا کی مخلوق اس سے بہتر سوچ بھی نہیں سکتی اس لئے انسان اشرف المخلوقات ہے۔تو دنیا میں زندگی گزارنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں بنایا ہے اور ہمیں عقل دے دی ہے اب ہمیں اور کسی مزید چیز کی ضرورت نہیں ہے سورۂ یٰسین میں ہے اُس زمانے میں لوگ تھے جو کہتے تھے "وَمَا اَنۡزَلَ الرَّحۡمٰنُ مِنۡ شَیۡءٍ" رحمٰن کو کیا ضرورت

پڑی کہ کوئی چیز اُتارے وحی اُتارے اور پیغمبر بھیجے بس جو عقل میں آئے کرتے رہو آپ ایسے ہی روکتے رہتے ہو اگر آپ سور کا گوشت نہیں کھانا چاہتے تو نہ کھاؤ اگر کوئی کھانا چاہتا ہے تو آپ اس کو کیوں روکتے ہیں۔ایک آدمی یہ کام کرنا چاہتا ہے تو کرے آپ ڈرتے ہیں تو آپ مت کریں۔ یہ تصور لوگوں میں پہلے بھی تھا آج بہت زیادہ ہے حتیٰ کہ آپ سمجھیں کہ مسلمانوں میں بھی بہت سارے لوگوں اسی مزاج کے ہیں۔ دوسرے طرز زندگی دنیا میں یہ ہے کہ ہم انسان ہیں اللہ نے ہمیں پیدا کیا ہے ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ہمیں تمام مخلوقات میں سے اللہ نے اعلیٰ بنایا ہے اور پھر اللہ نے ہمیں ایک MORALITIY دی ہے۔ یہ نیکی ہے، یہ بدی ہے، یہ حلال ہے، یہ حرام ہے، یہ صحیح ہے، یہ غلط ہے، ہر انسان کے اندر ضمیر ہے، یہ کام کرنا چاہیے، یہ نہیں کرنا چاہیے، بچے بھی جانتے ہیں، بچے بھی کھیلتے ہیں کوئی ایسی بات ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ غلط ہو گیا، بے ایمانی ہو گئی اس کا مطلب ہے کہ کوئی تصور تو ہے جانوروں میں یہ نہیں ہے۔تو اللہ نے انسان کے اندر ایک MORALITIY پیدا کی ہے۔اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے ''فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا'' اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنا کر اس میں نیکی کی تعلیم بھی رکھی ہے کہ یہ اچھے کام ہیں اور برائی بھی سمجھا دی ہے کہ یہ بُرے کام ہیں۔ جو نیکی اختیار کرے گا وہ اللہ کے ہاں اجر پائے گا۔اللہ نے ایک اور زندگی بھی بنائی ہے، جو آخرت کو نہیں مانتے دین پر نہیں چلتے انہیں کیا معلوم کہ ایک اور زندگی بھی ہے وہ تو سمجھتے ہیں کہ انسان مر گیا تو مر گیا جیسے کتا مر جائے یا گدھا مر جائے تو بس مر گیا۔ جبکہ ایک انسان اللہ اور اُس کے رسول کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کا تصور یہ ہوتا ہے کہ مرنا ختم ہونے کا نام نہیں ہے بلکہ مرنے کے بعد ایک اور زندگی ہے اور اصل زندگی وہ ہے جو بہت بڑی زندگی ہے ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے اور اُس میں نتیجہ اس دنیا کے اعمال کے مطابق نکلے گا جو اللہ کا کہنا مانتا ہے اُس کے لئے جنت ہوگی آرام ہوگا سکون ہوگا اور جو اللہ کا کہنا نہیں مانتا من مرضی کرتا ہے اُس کو سزا ملے گی۔ پہلے یہ ایمان ہوگا تو آگے بات چلے گی۔اُس اللہ نے ہماری رہنمائی کے لئے پیغمبر بھیجے رسول بھیجے، کتابیں بھیجیں، قرآن مجید بھیجا، اس کے ہم ماننے والے ہیں۔اُن پیغمبروں میں سے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ہم اُن کے ماننے والے ہیں اُن کے امتی ہیں اُن کے پیروکار ہیں۔قرآن مجید آخری کتاب ہے ہم اُس کے علمبردار

ہیں ہم اُس کو مانتے ہیں۔ تو یہ وہ باتیں ہیں جو بنیادیں ہیں جو آج ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہوتی جارہی ہیں اور جب ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو رہی ہیں تو ہماری اولاد کے ذہنوں سے بھی اوجھل ہو رہی ہیں، معاشرے سے اوجھل ہو رہی ہیں، میڈیا اس کے خلاف چل رہا ہے اور جو کوئی رئی سہی کسر ہے اُس کو WASH کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ اگلی نسل میں کوئی احساس ہی نہ رہے۔ یورپ و امریکہ میں انہوں نے 60ء سے اس منصوبہ پر عمل شروع کیا تھا کہ ایک ایسی سوسائٹی بناؤ جو MORALLESS سوسائٹی ہو، نئی نسل کو ایسی تعلیم دو کہ ان کے سامنے کوئی اخلاق و کردار ہو ہی نا۔ اخلاق یا "MORAL" کا لفظ ہی ختم کر دو اور VALUELESS SOCIETY بنادو۔ سابقہ کچھ اثرات چلے آ رہے تھے اُس کے بعد دو نسلیں آ چکی ہیں۔ اب جو نسل اس وقت وہاں تیار ہو کر برسر اقتدار ہے یا جو اگلی نسل آ رہی ہے اُس میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں وہ تو بہائم ہیں، BEAST ہیں وہ سب، حیوان ہیں، درندے ہیں، بے رحم ہیں، وہ دجال جو کہا جاتا ہے کہ آئے گا اس کی ایک تہذیب ہوگی وہ یہی ہے یہ انسان نہیں ہیں ظالم ہیں، بے رحم، بے حس، اُن کے ہاں کوئی اخلاقی قدر نہیں ہے۔ ہم اگر اپنے بارے میں سوچتے ہیں کہ ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں تو ہمیں پہلی ذمہ داری تو یہی فرض کرنی چاہیے کہ ہمیں اپنے ایمان کی حفاظت کرنی ہے اولاد کی باری تو بعد میں آئے گی خود مسلمان بن کر رہنا ہے ایمان کی حفاظت کرنی ہے اللہ کو ماننا ہے محمد رسول اللہ ﷺ کو ماننا ہے قرآن کو ماننا ہے آخرت کو ماننا ہے اور اللہ اُس کے رسول کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کرنا ہے۔ ہم ایسے ہی اُوپر اُوپر سے مانتے ہیں، زبان سے کہتے ہیں کہ مانتے ہیں جی مانتے ہیں..........اور عملاً کرتے کیا ہیں؟۔ شادی بیاہ میں تو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکام نہیں مانتے باقی کس چیز میں مانیں گے؟۔ تو کیا دعویٰ ہے ہمارا کہ ہم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو مانتے ہیں، یہ بے بنیاد دعویٰ ہے۔ جو بالکل نجی معاملہ ہے اُس میں بھی ہم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا کہنا ماننے کو تیار نہیں ہیں اگر کوئی ملکی معاملہ ہے یا امریکہ کا دباؤ ہے وغیرہ تو چلو دور کی بات ہے۔ لیکن نجی معاملہ مثلاً شادی جو ہمارے ہاں ہوتی ہے، دلہا بھی مسلمان، دلہن بھی مسلمان، دلہے کے والدین بھی مسلمان، دلہن کے والدین بھی مسلمان، ساری برادری مسلمان اور اُس میں رسمیں ساری غیر اسلامی، وہ کون کہہ کر جاتا ہے اس میں کوئی امریکہ کا

دباؤ ہے؟۔ یہ معاشرتی دباؤ ہے معاشرے کا چلن ہے ہم اپنی عزت رکھنا چاہتے ہیں معاشرہ میں کہ ہم بھی ماڈرن ہیں، ہم کوئی جنگلی نہیں ہیں یا ہم کوئی پینڈو نہیں ہیں ہمارے پاس بھی پیسے ہیں۔ جناب ہم ایسے شادی کر سکتے ہیں ایسے بینڈ آ سکتا ہے اور ایسے ہو سکتا ہے اور ایسے ہو سکتا ہے۔ ہم اس کی وجہ سے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرتے ہیں تو کہاں گیا ہمارا دعویٰ ایمان کا۔

دوستو! آج کے دور میں پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے ایمان کی حفاظت کیجیے۔ اللہ پر ایمان، آخرت پر ایمان، رسولوں علیہم السلام پر ایمان اور قرآن پر ایمان۔ اب بات سمجھ میں آئے گی کہ بحیثیت والدین ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں اور اگر ہم چھوٹے ہیں تو پتہ چلنا چاہیے کہ بحیثیت اولاد ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے، ایک عام انسان کے حوالے سے بات کی ہے کہ والدین کی اپنی اولاد کے ضمن میں ذمہ داریاں یہ ہیں۔ حضرت لقمانؒ ایک عام انسان ہیں، مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے اور کسی پیغمبر کے اُمتی بھی نہیں تھے وہ اپنی گفتگو میں بظاہر کسی رسول کا ذکر بھی نہیں کر رہے فوری کسی کے اُمتی بھی نہیں تھے ایک عقل مند، سمجھ دار انسان ہیں اور اُنہوں نے اپنی اولاد کو کچھ اُصولوں پر تربیت دی ہے وہ اُصول اتنے اعلیٰ اور اتنے قیمتی ہیں کہ آبِ زر سے لکھے جانے والے ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بطور وحی درج کر دیا اور اُس کی فہرست مکمل کرنے کے لئے اللہ نے اپنی طرف سے دو مزید احکام بھی دے دیے۔ تو حضرت لقمان عرب میں ہی کہیں تھے اور اللہ نے اُن کا ذکر اس لحاظ سے بھی کیا ہے جو بھی ذرا سا سمجھ دار انسان ہے اور سوچتا ہے اُس پر اتمام حجت ہے۔ جیسے آج کے دور میں علامہ اقبال بہت سارے لوگوں پر اتمام حجت ہیں گو وہ کوئی باعمل انسان نہیں تھے لیکن ایک حجت ہے۔ لوگ ذرا پڑھ جاتے ہیں، F.A کر جائیں، INTER کر جائیں، ذرا امریکہ کا چکر لگا آئیں تو وہ دین سے دور ہو جاتے ہیں یہ قرآن پتہ نہیں کیا کہتا ہے، دنیا بڑی ترقی کر گئی ہے اور آپ ابھی قرآن کی باتیں کرتے ہیں کہ یہ کرو اور یہ کرو۔ علامہ جیسا آدمی جو سو سال پہلے 1903ء میں گئے تھے اور 1907ء میں لوٹ کر آئے تھے جبکہ برطانیہ کا عروج تھا اور واپس آ کر کہا ہے کہ مجھے قرآن میں بس پناہ ملی ہے

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی

میرے جرمِ خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں

قرآن میں پناہ ملی۔ اتمام حجت ہے کہ ایک بندہ اُس وقت یورپ جا کر پڑھ کر آ گیا اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی بات کر سکتا ہے آج تو امریکہ رُو بہ زوال ہے وہ تو ختم ہونے کو ہے تو آپ پر اُس کا کیا جادو چڑھ گیا کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی بات نہیں کرتے۔ یہ اتمام حجت ہے۔ اسی طرح حضرت لقمان ہیں ان کا دور یوں سمجھئے کہ حضور ﷺ سے ہزار سال پہلے کا ہے عرب میں اُن کی امثال مشہور تھیں، اُن کی باتیں مشہور تھیں لوگ اُس کا حوالہ دیتے تھے اور وہ ایک دوسرے کی بات مان جاتے تھے۔ جیسے آج پڑھے لکھے جب کسی موضوع پر بات کریں اور کوئی آدمی اپنی حمایت میں علامہ اقبال کا کوئی شعر پیش کر دے تو بات طے ہوگئی کہ اگر علامہ اقبال یہ کہتے ہیں تو بات ٹھیک ہے۔ اسی طرح عرب کے لوگ حضرت لقمانؑ کی بات مانتے تھے۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ حضرت لقمان یہ کہتے ہیں......بس بحث ختم ہو جاتی تھی مانے یا نہ مانے بات ختم ہوگئی۔ قرآن مجید نے مکہ والوں پر اتمام حجت یہ کیا ہے کہ جناب تم شرک کرتے ہو، بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے ہو، محمد ﷺ کی بات نہیں مان رہے ہو، آخرت کو نہیں مانتے حالانکہ تمہارے حضرت لقمان بھی یہی کہتے ہیں بس خاموشی................ ماننا نہ ماننا اور بات ہے۔ لیکن آگے ان کی طرف سے بحث نہیں ہے۔ وہ لقمان کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے سے پہلی بات کیا کہی ہے

وَ اِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ

یاد کرو لقمان جب اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے۔ ”یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ“ پہلی بات جو والدین کو اپنی اولاد کو سمجھانی چاہیے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنی اولاد کو جدید باطل نظریات سے اور آزاد خیالی سے اور مادر پدر آزادی سے بچائیں، LIBERALISM سے بچائیں۔ ہم ایک اللہ کے ماننے والے ہیں کائنات کا ایک خالق و مالک ہے اُس نے ہمیں پیدا کیا ہے ہم اُس کے بندے ہیں اُس نے حکم دیا ہے کہ میرا کہنا مانو اُس نے پیغمبر بھیجے اُس نے کتابیں اُتاری ہیں اور اس اقرار کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ہم پیغمبروں کو مانیں اور اس کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق زندگی گزاریں اور اگر کوئی WRITTEN کہے یا SPOKEN کہے کہ جی میں اللہ کی بات نہیں مانوں گا میں تو یہ مانوں گا وہ اللہ کی ذات کے ساتھ شرک کر رہا ہے کہ اللہ کی نہیں مان رہا، وہ تو کسی

'جعلی' کوخدا مانتا ہے اُس کے مطابق زندگی گزار رہا ہے۔ حضرت لقمان نے فرمایا''یَـــا بُـنَـــیَّ لَاتُشْـرِكْ بِـــاللّٰـهِ ' پہلی ذمہ داری والدین کی یہ ہے کہ اپنی اولاد کی تربیت کرتے ہوئے اُن کے ذہن سے شرک نکال دو۔ شرک کا شائبہ نہیں رہنا چاہیے۔ یہ مختلف طریقوں سے آجاتا ہے اور مختلف انداز سے آتا ہے

ے براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان ہوا کہ جان عزیز ہے؟ نہیں...... میں تو اللہ کو مانتا ہوں مجھے جان عزیز نہیں ہے میں اس کو اللہ کے لئے قربان کر دیتا ہے آگ میں ڈال دیا گیا کود گئے

ے بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشا لب بام ابھی

اللہ کا حکم عزیز ہے تو کوئی اور حکم چھوڑ دو وہ چھوڑ دیتے ہیں۔ بڑی عمر میں اللہ نے بیٹا دیا بیٹا عزیز ہے یا اللہ کا حکم......کیا عزیز ہے؟ بیٹے اور بیوی کو جنگل میں چھوڑ آؤ چھوڑ آتے ہیں کوئی بات نہیں۔ بیٹا جب ذرا بالغ ہوا12،14 سال کا تو بیٹا عزیز ہے یا اللہ کا حکم عزیز ہے۔ جی اللہ کا حکم عزیز ہے ابھی پتہ چل جاتا ہے اس بیٹے کو ذبح کر دو اُنہوں نے چھری چلا دی۔ اُن کی اولاد میں محمد ﷺ آنے والے تھے جس کی وجہ سے اللہ نے بچالیا ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری چلا دی تھی قرآن کہہ رہا ہے:''قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ......''اے ابراہیم آپ نے تو خواب سچا ہی کر دیا۔ تو اللہ نے مختلف آزمائشوں میں پورا اُتار دیا۔ یہ پہلی بات ہے کہ شرک سے بچنا۔ اپنے وطن، والدین، اولاد، بیوی بچے......ان سب پر اللہ کا حکم فائق ہے اللہ کہے تو میں کیا میری اولاد بھی حاضر ہے مال دولت کاروبار سب حاضر ہے ہر چیز حاضر ہے ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہوں اور اگر یہ نہیں ہے تو شرک ہے اور کسے شرک کہتے ہیں؟۔ اولاد بھی اللہ کے ساتھ شریک ہوگئی اور بیوی بھی شریک ہوگئی ہے اور کاروبار بھی شریک ہو گیا ہے۔ حضرت لقمانؑ کہہ رہے کہ''لَاتُشْـرِكْ بِـاللّٰـهِ ......'' بحیثیت مسلمان اگر تم والدین کی ذمہ داریاں سمجھنا چاہتے ہو تو خود شرک سے بچو اگر خود بچو گے تو اپنی اولاد کی تربیت کرو گے۔ شرک نہیں کرنا۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

بے شک اللہ کا حکم چھوڑ کر کسی اور کا حکم ماننا، اس غیر کو اللہ کے برابر کرنے والی بات ہے، یہ نہیں ہونا چاہیے غلطی تو ہو سکتی ہے لیکن مستقل طور پر طے نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ کا حکم نہیں مانوں گا فلانے کا مانوں گا۔ یہ شرک ہے اور شرک سب سے بڑی ناانصافی ہے۔

یہ پہلی نصیحت حضرت لقمان نے کی ہے اور یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ پہلے خود اس پر عمل کریں اور پھر اولادوں کے ذہنوں میں ڈالیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو ذہنوں میں ڈالتے ہیں بہت سے تو خود تعویز لے کر دیتے ہیں کہ گلے میں لٹکالو۔ خود مزاروں پر لے جاتے ہیں خود پیروں کے پاس لے جاتے ہیں سر پر ہاتھ پھرواتے ہیں تو بڑا ہو کر بچہ ویسے ہی کرے گا اور کیا کرے گا۔ آپ کیا توقع رکھتے ہیں کہ وہ قرآن کو مانے گا اور قرآن کو پڑھے گا؟ اپنی ذمہ داری ادا کرو شرک سے خود بھی بچو اور اپنی اولاد کو بھی بچاؤ۔

اس رکوع کے درمیان میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مزید باتیں کہی ہیں جن کا بعد میں ترجمہ کروں گا۔ حضرت لقمان کی اگلی نصیحت یہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل بڑا ہو یا چھوٹا رائی کے دانے کے برابر وہ بھی اللہ لے آئے گا.......... بیٹے کو نصیحت کر رہے ہیں سمجھا رہے ہیں اولاد کو سمجھانا چاہیے ہم مسلمان ہیں ہم اللہ کو مانتے ہیں آخرت کو مانتے ہیں، قرآن کو مانتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا عارضی ہے مرنا ختم ہونے کا نام نہیں ہے مرنے کے بعد اصل زندگی ہے حساب کتاب ہونا ہے کہ تم نے زندگی میں کیا کیا تھا، ہر انسان کی پوری زندگی کی ویڈیو بن رہی ہے، اللہ نے کیا انتظام کر رکھا ہے؟ یہ ہم سے ہر شخص کے ذہن میں موجود ہے۔ یہ بڑی عمر کے لوگ بیٹھے ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ کبھی کوئی پرائمری کا کلاس فیلو کہیں سٹیشن پر یا بازار میں نظر آجاتا ہے یا کہیں سے اس کی آواز کان میں پڑتی ہے تو آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ اوہ یہ تو فلانا ہے اور آدمی اُس کی داڑھی اور سفید بالوں میں سے اُس کا وہ پرائمری کا چہرہ نکال لیتا ہے کہ اُس وقت اس کا یہ چہرہ ہوتا تھا یہ کپڑے پہنتا تھا یہ کلاس میں اس بینچ پر بیٹھتا تھا اس کا یہ رول نمبر تھا یہ فلانے گاؤں میں فلان مکان میں رہتا تھا۔ وہ آپ کے ذہن میں کہیں محفوظ ہے تو آپ نے نکالا ہے، وہ ساری ویڈیو آپ کے ذہن میں آگئی اُس کی آواز تک محفوظ ہے۔ صاف ظاہر ہے پچاس، پچپن سال کا ہو گیا ہو گا اُس کی

آواز بدل گئی چہرے کے نقوش بدل گئے لیکن آپ نے اس کا پرانا چہرہ نکال لیا اُس کی آواز آپ کے ذہن میں کہیں محفوظ ہے اُس کی تصویر محفوظ ہے، پوری کلاس کی بلکہ بے شمار لوگوں کی موجود ہے جو آپ کے دوست ہیں۔ انسان کے اپنے اس گوشت پوست کے دماغ میں جو ہمارے کھانے پینے سے بنتا ہے اسی میں کہیں ویڈیو بن رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کراماً کاتبین کے ذریعے یا کسی اور ذریعے سے جو وڈیو بنا رہا ہے وہ تو اضافی گواہیاں جمع ہو رہی ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور آخرت کے ماننے والے ہیں اور اعمال کا نتیجہ نکلنا ہے جنت یا دوزخ۔ یہ تصور پہلے خود ہمیں اپنے ذہن میں بٹھانا ہوگا کہ جناب یہ ایسے ہی ہے۔ آج ہمیں خود یقین نہیں ہے اور پھر اولاد کے ذہن میں بٹھانا ہے پہلے آپ کو یقین ہوگا تو آپ اولاد کے ذہن میں بٹھائیں گے۔ اگر آدمی خود سگریٹ پیئے اور بچے کو کہے کہ اگر میں نے تم کو سگریٹ پیتے دیکھ لیا تو جان سے مار دوں گا۔ اُس پر کوئی اثر ہوتا ہے؟ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پہلے خود عمل کرنا پڑے گا آخرت کو اپنا مطمع نظر بنانا ہوگا اللہ راضی ہو جائے اللہ کے رسول ﷺ راضی ہو جائیں جنت کا حصول ممکن ہو جائے اسلام و ایمان پر موت آ جائے یہ VALUES پہلے اپنے میں ہوں گی تو آدمی اولاد کو بھی کہہ سکے گا۔ حضرت لقمانؒ یہ کہہ رہے ہیں

یا بُنَیَّ ......''اے میرے بچے'' اِنَّھَا اِنۡ تَكُ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ فَتَكُنۡ فِیۡ صَخۡرَةٍ اَوۡ فِی السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِی الۡاَرۡضِ یَاۡتِ بِهَا اللّٰهُ......

تمہارا کوئی کام، بڑے تو ہیں ہی ہیں چھوٹے سے چھوٹا کام رائی کے دانے کے برابر بھی' پرانے زمانے میں آنکھ سے کوئی چھوٹی چیز جو نظر آ سکتی تھی وہ رائی کا دانا ہے یا ریت کا ذرہ ہے۔ آج تو ٹیلی سکوپ ہے مائیکروسکوپ ہے۔ فرمایا: اگر اس سے بھی کوئی چھوٹی چیز ہے وہ بھی اللہ لے آئے گا۔ چاہے تم نے کوئی کام پہاڑوں کی بلندیوں پر کیا ہے، غاروں میں کیا ہے، ہوائی جہاز میں کیا ہے۔ تب بھی اللہ تعالیٰ اُس کو لے آئے گا۔ اِنَّهٗ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ اللہ تو بڑا باریک بین ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ اُس سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے۔

یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ اس بنیادی بات کو اپنے ذہن میں رکھیں اُن کا عمل یہ ظاہر کرے گا تو وہ بات آگے اولاد میں ٹرانسفر ہوگی ورنہ ممکن نہیں ہے ہو نہیں سکتا کہ والدین کو کسی بات پر یقین نہ ہو وہ اولاد کو ٹرانسفر ہو جائے۔ اولاد سے مراد صرف بیٹے نہیں ہے بیٹیاں بھی ہیں۔

اور والدین میں والد اور والدہ دونوں آتے ہیں۔ مرد کی ذمہ داری میں اُس کی بیوی بھی شامل ہے کہ اُس کو بھی ان باتوں کی تلقین کرے۔ خاوند کی ذمہ داری ہے کہ اپنی بیوی کو بھی سمجھائے۔ بیوی کو سمجھائے گا تو والدین 'ہم ذہن' بن جائیں گئے، اور اب والدین کی آگے اولاد پر ذمہ داری ہے کہ اولاد کو بھی سمجھائیں۔ تو سارے خاندان کی ایک سوچ تب بن سکتی ہے جبکہ پہلے والدین کی سوچ صحیح ہو۔ تیسری بات جو حضرت لقمان کہہ رہے ہیں وہ یہ ہے

''یَا بُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ''

اے میرے بچے! نماز قائم کرو

اُس وقت کی نماز کیا تھی یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ آج کی نماز وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سکھائی ہے۔ پانچ وقت نماز فرض ہے۔ والدین پہلے نماز پڑھیں گے تو اولاد کو حکم دیں سکیں گے والدین کی ذمہ داری ہے کہ اولاد کو بتائیں اور وہ اُسی وقت اولاد کو بتا سکتے ہیں جب خود نماز پڑھیں گے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃ ......''نماز کو قائم کرو'' چوبیس گھنٹے کی زندگی میں کتنی ہی مصروفیت ہو جائے نماز کے لئے وقت نکالنا ہے۔ تم نے اللہ کو مانا ہے تو اُس سے لو لگانے کے لئے، اُس کے سامنے حاضری کے لئے اس کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے وقت نکالنا ہے۔ تمہارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اللہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلا سکو کہ اے اللہ میں تیرا وفادار ہوں۔ جو انسان چوبیس گھنٹے میں سے نماز کے لئے وقت نہیں نکال سکتا وہ اللہ کی کیا وفاداری کرتا ہے وہ عملاً اللہ کا باغی ہے۔ نماز کیا ہے؟ اللہ کے سامنے جا کر کچھ باتوں کا اعتراف ہے کہ "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ، اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ" یہ اپنی وفاداری کا یقین دلانے والی بات ہے۔ اے اللہ میں کاروبار میں گیا تھا ذرا بھول گیا تھا، میں پھر آ گیا ہوں، میں تیرا وفادار ہوں تیرا بندہ ہوں۔ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے اے اللہ تو معاف فرما درگزر فرما۔ حضرت لقمان بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ پہلے والدین کے ذہن میں یہ بات ہوگی تو اولاد کو سمجھا سکیں گے۔ جس گھر کے والدین خود نماز نہیں پڑھ رہے وہ اپنی اولاد کو کیا سمجھائیں گے؟ یا جس گھر کے بچے نمازیں نہیں پڑھ رہے کس کا قصور ہے؟۔ کیوں نہیں پڑھ رہے سوچنا پڑے گا کہیں گڑبڑ ہے۔ والدین کے اپنے کردار میں کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے۔ تو پہلے اپنا کردار صحیح کرنا چاہیے۔ بھئی یہی ہوا ہوگا کہ والدین بھی پہلے نہیں پڑھتے تھے بعد میں انہیں خیال

آیا ہےاوراولاد بھی جانتی ہے اگر وہ پندرہ، سولہ سال کی ہے کہ والد نے دوسال پہلے توبہ کی ہے اور نماز پڑھنی شروع کی ہے، بچوں کوتو پتہ ہے کہ ابو جان پہلے نماز نہیں پڑھتے تھے۔تو اُس کا حل کیا ہے؟ ایک حل یہ ہے کہ نہیں پڑھتا نہ پڑھے خود بڑی عمر میں سمجھ آجائے گی خود توبہ کرلے گا۔ایک یہ ہے کہ اولاد کواکٹھا کرو اور اُن کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرلو کہ بیٹو! مجھ سے غلطی ہوگئی میں بہت سال اللہ کا نافرمان رہا پھراللہ نے مجھے توبہ کی توفیق دی تو اگر تم میری مانو تو ابھی سے تم اللہ کا کہنا مانو اسی میں بہتری ہے۔اگر آپ یہ اعتراف کرلیں گے تو آپ کی اولاد کو شاید سمجھ آجائے کہ ابوٹھیک کہہ رہے ہیں اور وہ آج سے ہی نماز شروع کردیں۔اگر آپ اپنی اولاد کے سامنے یہ اعتراف نہیں کرسکتے کہ جی شرم آتی ہے تو پھر پتہ نہیں آپ کی اولاد کو نماز کی توفیق ملے گی یا نہیں ملے گی وہ شاید آزاد خیال ہی رہے حالات تو خراب ہو ہی رہے ہیں میڈیا اثر انداز ہو رہا ہے دن بہ دن بہت سارے لوگوں کو گمراہ کرکے لے جارہا ہے۔تو اعتراف کرلینے میں بھلائی ہے کہ میرے بیٹے میں بہت عرصہ اللہ کا نافرمان رہا غلطیاں ہوتی رہیں نماز نہیں پڑھ سکا دین پر عمل نہیں کرسکا اب میں نے توبہ کرلی ہے۔تو اب میری بات مانو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑنے کو تیار ہوں کہ تم ابھی سے اللہ کی فرمابرداری شروع کردو ''یَا بُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ''۔

اس سے اگلی بات جو حضرت لقمان کہہ رہے ہیں وہ بہت اہم ہے شاید کوئی اچھے والدین بھی اپنی اولاد کو نہیں سکھاتے وہ خود نہیں کرتے اولاد کو کیا سکھائیں گے

وَ أْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ

بیٹے 'امر بالمعروف' کرتے رہو اور 'نہی عن المنکر' کرتے رہو۔اُصول کی بات یہ ہے کہ نیکی پر خود عمل کرو اور نیکی کو پھیلاؤ اور برائی سے رکو اور برائی سے دوسروں کو روکو۔معروف کسے کہتے ہیں آپ نے کبھی سوچا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ فلاں بڑی معروف شخصیت ہے فلاں چیز بڑی معروف ہے یعنی جانی پہچانی ہے بعض چیزیں ایسی ہیں جو اللہ نے فطرت انسانی میں ڈال دی ہیں مثلاً سچ بولنا ہر آدمی کا دل گواہی دیتا ہے۔جیسے کوئی معروف شخصیت ہوتی ہے اس کو ہر بچہ بھی جانتا ہے جیسے کوئی علاقے کا ایم این اے ہوتا ہے جس کے گلی گلی میں اشتہار لگے ہوئے ہیں بچوں نے وہ ٹوپیاں پہنی ہوتی ہیں جو بھی الیکشن آتا ہے۔ہر آدمی کے ذہن میں نقش ہے کہ فلاناں آدمی ہمارے علاقے کا

ایم۔این۔اے یا ناظم ہے۔اسی طرح معروف وہ چیز ہے جس کی اچھائی اللہ نے ہمارے دل میں ڈالی ہے سچ بولنا چاہیے خدمت خلق کرنی چاہیے لوگوں کے کام آنا چاہیے۔ یہ معروف چیز ہے یعنی جانی پہچانی ہے ہر شخص کا دل گواہی دیتا ہے جو میرا دل گواہی دیتا ہے اور آپ کا بھی دیتا ہے ہر مرد و عورت کا دل گواہی دیتا ہے اس کے لئے کوئی تعلیم کی بھی ضرورت نہیں۔صرف ٹوبہ کے لوگوں کا نہیں بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کا دل گواہی دیتا ہے۔ جو انسان ہے اور اُس کے اندر ضمیر ضرور ہوتا ہے ضمیر زندہ ہے تو ضرور گواہی دے گا۔اور 'منکر' کسے کہتے ہیں 'اوپراہٹ'۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جس سے طبیعت گھبراتی ہے ہر آدمی جس کی عقل ٹھکانے ہے اور ذرا سا بھی اُس کو والدین کی طرف سے معقول ماحول ملا ہے، جھوٹ بولنے سے پرہیز، بددیانتی سے پرہیز، دھوکے سے پرہیز۔ دیکھو ہم سب بیٹھے ہیں ہمارا کوئی بہت زیادہ دین داری کا دعوی نہیں ہے لیکن اگر ہم میں سے بھی کسی کو کوئی کہے کہ یار مجھ پر بہت بڑا مقدمہ بنا ہوا ہے اور مجھے گواہ کی ضرورت ہے تم میرے دوست ہو یہ پانچ لاکھ روپے لے لو اور کل چل میرے حق میں کر گواہی دے دو یہ کہہ دو کہ یہ بندہ صحیح ہے بس۔کیا آپ تیار ہو جائیں؟ اگر آج کے ماحول میں ہم جیسا انسان بھی پانچ لاکھ روپے لے کر بھی جھوٹی گواہی دینے پر بھی تیار نہیں ہے تو یہ آپ کو کونسی چیز روکتی ہے۔انسان کے اندر کوئی چیز ہے جس نے انسان کو روکا ہوا ہے کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے چاہے دس لاکھ مل جائیں، کروڑ مل جائیں تب بھی یہ کام نہیں ہوسکتا۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دس لاکھ پے راضی ہو جائیں گے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو کہیں گے کہ مجھے ایک لاکھ ارب ڈالر بھی ملیں تو میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔تم دفعہ ہو جاؤ آئندہ میرے سامنے ایسی بات نہ کرنا۔ یہ تو ایمان کی بات ہے۔تو اللہ نے جن چیزوں کے بارے میں دل میں ڈالا ہے کہ یہ کام غلط ہیں وہ منکر ہے۔حضرت لقمان کہہ رہے ہیں بیٹے کو کہ تمہارا دل جو گواہی دیتا ہے اُس کو عام کرو اور جس سے تمہارا دل گھبراتا ہے وہ نہ خود کرو اور نہ دوسروں کو کرنے دو۔بھئی یہ کام غلط ہے تم نے یہ کام کیوں کیا، ملاوٹ کیوں کر رہے، ہو بے ایمانی کیوں کر رہے ہو، رشوت کیوں لے رہے ہو، یار آپ گالیاں کیوں دیتے ہیں، معقول بات کیا کرو گالیوں کے بغیر بھی بات سمجھائی جا سکتی ہے لوگوں سے اور مزدوروں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے بات جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہی ہے۔وَ أْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ......

اور یہ اتنی بنیادی بات ہے کہ اللہ نے اس کو وحی بنا کر قرآن میں درج کر دیا۔ اب یہ وحی خداوندی ہے اُس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اور اللہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر رہا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ بھی کر رہے ہیں

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ

اور یہ اُمت کا فریضہ ہے

وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

اور...... كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

کہ تم مسلمان بنائے ہی اس لئے گئے ہو کہ لوگوں کو امر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو۔ یہ اہم بنیادی بات ہے اور دنیا کا اُصول ہے جو حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو کہی۔ نتیجہ کیا نکلا کہ تمام والدین کو یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر والا اُصول اپنانا چاہیے اور پھر اسی سے اولاد میں آگے یہ بات پیدا ہو گی۔ جس گھر میں والدین امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہوں گے اُس گھر کے بچے بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں گے اور اگر کسی گھر کے بچے امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہیں کرتے اس کا مطلب ہے کہ اُن کے گھر میں اُس کا تذکرہ نہیں ہے۔ والدین تذکرہ نہیں کرتے یہ اُن کی کوتاہی ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے بچے پہچانے جاتے تھے کہ یہ فلانے کا بیٹا ہے۔ اُس کے اخلاق سے پہچان لیا جاتا تھا کہ یہ شریف بچہ ہے فلانے کا بیٹا ہے اور اسی طرح اگر کوئی بدتمیزی کر رہا ہے، گالیاں دے رہا ہے کیا وہ کسی ایسے والدین کا بیٹا ہو سکتا ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہوں؟ نہیں ہو سکتا ہے۔ جس گھر میں والدین امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں گے اُن کی اولاد بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے گی اور جس گھر کے بچے امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہیں کرتے اُن کے والدین امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہیں کرتے۔ جس کی زبان پر گالیاں ہیں وہ گھر میں بھی گالیاں دیتا ہو گا ایسے بے شمار لوگ ہیں مسجد کا بھی خیال نہیں کرتے زبان پر گالیاں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں مسجد میں بھی گالیاں دیتے ہیں وہ گھر میں بھی

دیتے ہوں گے تو گھر میں اولاد کی زبان پر بھی گالیاں ہوں گی۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو مسجد میں الگ لے جاتے ہیں کہ صاحب آپ سے ایک بات کرنی ہے اب میں مسجد میں تو جھوٹ نہیں بول سکتا اس کا مطلب ہے کہ باہر تو جھوٹ بولتے ہی رہتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسا شخص گھر میں جھوٹ بولتا ہوگا تو گھر والے بھی بولتے ہوں گے۔

حضرت لقمان اپنی اولاد کو روک رہے ہیں۔ معقول آدمی وہ ہے جو خود بھی بُرائی سے رُکے۔ والدین کو چاہیے کہ خود رکیں اور آگے اپنے عمل سے، کردار سے، قول سے اور جو بھی طریقہ ہوسکتا ہے اس کے مطابق اولاد کے لئے نمونہ بنیں تا کہ اولاد کی صحیح تربیت ہو۔

اگلی بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے جس کا آج فقدان ہے بہت ساری باتیں ایسی ہیں جو آج ہمارے اندر نہیں ہیں پہلے ہوتی تھی۔ آپ دیکھیں سو سال پہلے مسلمانوں میں غیرت تھی، مسلمانوں میں کوئی دینی جذبہ تھا، مسلمان تلاوت کرتے تھے مسلمان باکردار ہوتے تھے۔ اب بہت ساری باتیں نہیں ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں اُنہیں میں سے ایک یہ بھی ہے جو حضرت لقمان اپنے بیٹے سے کہ رہے ہیں:

"وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ"

اے میرے بچے امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنے میں تم پر مشکلات آئیں گی جو بھی تم پر گزر جائے اُس کو برداشت کرو، کیا یہ آج ہمارے اندر ہے؟ اور صاف ظاہر ہے پہلے والدین کریں گے تو اولاد کرے گی جب والدین ہی نہیں کرتے تو اولاد کیا کرے گی۔ یہ وہ آج کردار (CHARACTER) کی کمی ہے کہ آدمی اگر کوئی بات کہے تو اس کے مطابق اُس کا کردار ہونا چاہیے۔ آدمی کہے کہ یہ بات غلط ہے تو کردار گواہی دے رہا ہونا چاہیے کہ واقعی یہ بات غلط ہے۔ آدمی کہے کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے اُس کے کردار گواہی دے رہا ہو کہ یہ آدمی واقعی سچا ہے اس نے اتنے سالوں میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ حضرت لقمان والدین کی ذمہ داری بتا رہے ہیں کہ "وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ" امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہوئے تم پر جو کچھ بیت جائے۔ صاف ظاہر ہے تکلیفیں آئیں گی لوگ ناراض ہوں گے۔ دنیا میں اُصول ہے 'اَلْحَقُّ مُرٌّ' کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ آپ سڑک پر سے گزریں بچے کرکٹ کھیل رہے ہوں آپ منع کر کے دیکھ لیں

کہ یہاں کیوں کھیل رہے ہو گراؤنڈ میں جا کر کھیلو' عزت بچا کے جانا مشکل ہو جائے گا۔۔ بڑے جابر حکمرانوں کے سامنے حق بیان کرنا کوئی آسان ہے.......... جان جاتی ہے۔ بچہ گھر سے سکول لیٹ آئے یا سکول سے گھر لیٹ پہنچے پوچھا جاتا ہے کہ کیا وجہ بنی؟ سچ بتانا مشکل ہوتا ہے اس میں آپ کا بھی تجربہ ہے اور میرا بھی تجربہ ہے جان جاتی ہے۔تو دین کا تقاضا کیا ہے "وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ" مطلب یہی ہے کہ سچ بولو اور حق بات کہو چاہے کچھ بھی مصیبت آنے کا خطرہ ہو۔ والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ کردار پیدا کر کے نمونہ بنیں اور اولاد میں یہ کردار پیدا کریں INCENTIVE دیں، اُن کو انعام دیں حوصلہ بڑھائیں۔ ہم بچوں کو سکھاتے نہیں ہیں اس لئے کہ خود نہیں کرتے۔ جو آدمی گھر میں بیٹھا ہوا ہو اور باہر BELL بجے اور بچے کو کہے کہ جاؤ کہہ دو کہ ابو گھر پر نہیں ہیں۔ آپ اُس بچے سے سچ بولنے کی توقع کر سکتے ہیں؟ بچے کو پتہ ہی نہیں ہے کہ جھوٹ کیسے بولا جاتا ہے آپ نے اسے بولنا سکھا دیا ہے اب وہ ساری زندگی آپ کی یہ بات یاد رکھے گا کہ یوں بھی ہو سکتا اور خلاف حقیقت بھی بات کہی جا سکتی ہے۔ حضرت لقمان کی نصیحتیں والدین اور اولاد کے لئے بہت اہم ہیں۔

"وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ" کے ساتھ فرمایا "اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" یہ آسان کام نہیں ہے ہر آدمی اس معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے تھوڑی سی کوشش کرنی پڑتی ہے، اس کے تقاضے پورے کرنے پڑیں گے ہمت کرنی پڑے گی راتوں کو جاگ کر اللہ سے مانگنا پڑے گا قرآن بار بار پڑھنا پڑے گا اس سے کبھی گھر میں فاقے آ سکتے ہیں گھر میں تکلیف آ سکتی ہے کبھی شاید جیل جانا پڑ جائے۔ حضرت لقمان بیٹے کو آگاہ کر رہے ہیں "اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" کہ بیٹے یہ آسان کام نہیں ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کوئی حلوہ نہیں ہے کہ مزے لے کر کھا لیا جائے اور ذمہ داری بھی پوری ہو جائے۔

ہم میں سے کتنے لوگ یہ سمجھتے ہیں آج کل تصور یہ ہے کہ جنت میں جانا ہے تو نمازیں پڑھو، تسبیحات کرو جیسے صبح ٹہلتے ٹہلتے ہاتھ میں تسبیح پکڑ کر پڑھتے ہیں اس کو جنت میں جانا سمجھتے ہیں۔ پتہ نہیں کس نے اُن کو سمجھا دیا ہے قرآن میں تو اس طرح نہیں ہے قرآن یہ کہتا ہے

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ

وَ الثَّمَرَاتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ (البقرۃ۔155)

''اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے۔تو صبر کرنے والوں کو(اللہ کی خوشنودی کی)بشارت سنادو''

قرآن تو کہتا ہے کہ جنت کانٹے بھری راہ ہے اس میں جانا اتنا آسان نہیں ہے۔قرآن میں تو یہ ہے

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (البقرۃ۔214)

''کیاتم یہ خیال کرتے ہو کہ (یوں ہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تم کو پہلے لوگوں کی سی (مشکلیں) تو پیش آئی ہی نہیں۔ان کو (بڑی بڑی) سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ (صعوبتوں میں) ہلا دیے گئے، یہاں تک کہ پیغمبر اور مومن لوگ جو ان کے ساتھ تھے پکار اٹھے کہ کب اللہ کی مدد آئے گی؟''

قرآن تو یہ کہ رہا ہے اور قرآن کی بات صحیح ہے،صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا جارہا ہے۔

"اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" تو یہ بات بھی اولاد کو سمجھائیں کہ ہے یہ مشکل کام اُس کے لئے ہمت پیدا کرنی پڑتی ہے اعلیٰ ظرفی پیدا کرنی پڑتی ہے برداشت پیدا کرنی پڑتی ہے اور یہ دنیا میں بڑی اعلیٰ VELUES میں آسان کام نہیں ہے۔کم ظرف انسان ہوتا ہے جو چھوٹی سی بات پر غصے میں آجائے گالیاں دینی شروع کردے گا ذرا سی بات پر ادھر سے اُدھر ہو گیا۔قرآن حضرت لقمان کے حوالے سے بتا رہا ہے کہ اپنے اندر اعلیٰ ظرفی،تحمل مزاجی اور برداشت کا مادہ پیدا کیجئے۔اللہ سے توقع رکھیے اللہ سے معافی مانگیں غلطی ہونی نہیں چاہیے مگر بہر حال انسان ہے غلطی ہو جاتی ہے فرمایا:و اما ینزغنك من الشیطن نزغ فاستعذ بالله اگر کبھی غلطی ہو جائے تو اللہ سے معافی مانگو۔اے اللہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔اللہ معاف کردے گا۔

اس کے بعد اور بھی کچھ وصیتیں ہیں جو حضرت لقمان کے حوالے سے اولاد کو سمجھائی گئی ہیں۔(وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ) یہ اولاد کو سمجھانا چاہیے کہ محلے میں، برادری میں، دوستوں

کے سامنے تکبر اختیار نہ کریں۔عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کسی خاندان کے پاس پیسے آ گئے ان کے بچے نے موٹر سائیکل خرید لیا یہی بچہ جو گلی میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا اب اُن سے ملتا ہی نہیں ان کے سامنے سے تیزی سے موٹر سائیکل گزار کر چلا جاتا ہے کہ پاس پیسے ہیں۔

(وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا) زمین میں اکڑ کر مت چلو۔ظاہر سے لگ رہا ہے کہ تمہاری UPPER STOREY خراب ہے تمہارے اندر شعور نہیں ہے اکڑ کر چلنے سے کیا ہوتا ہے؟۔ قرآن میں ہے کہ تم اونچا چل لو گے اکڑ کر لو گے۔(اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا) پہاڑ کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے۔لیکن اس سے تمہاری MENTALTIY ظاہر ہو جائے گی کہ تمہارے اندر تکبر ہے۔(اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ) اللہ تعالیٰ شیخی خوروں کو اور ڈینگیں مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔اللہ تعالیٰ نے پیسہ دیا ہے اسلام کہتا ہے کہ یہ آزمائش کے لئے ہے۔آزمائش یہ ہے کہ سوچو کس کا حق بنتا ہے؟ رشتہ داروں عزیزوں اور دوستوں میں خرچ کرو۔اللہ کے دین کے لئے خرچ کرو۔اللہ نے پیسے اس لئے نہیں دیے کہ اپنے مکان پر لگا کر اور بڑا مکان بنا کر اور عیاشی کر کے لوگوں پر اپنا فخر جتاؤ۔والدین کی یہ ذمہ داریاں ہیں کہ وہ ان باتوں کا خیال رکھیں اور یہ باتیں اپنے عمل اور کردار سے اولاد کو بھی بتائیں۔

آخری بات یہ ہے کہ دنیا میں لوگوں کے درمیان اختلافات ہو جاتے ہیں جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ایک آدمی کا حق ہے دوسرا اُس پر قبضہ کئے بیٹھا ہے آدمی نے لینا ہے دوسرا دے نہیں رہا ہے۔اس طرح کے معاملات میں کچھ لوگ ایسے کرتے ہیں کہ اپنی بات منوانے کے لئے اونچا اونچا بولتے ہیں شور مچا دیتے ہیں اکثر جھوٹے آدمی ایسے کرتے ہیں شور مچا دیتے ہیں لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے اور جو صحیح حق دار اور مستحق ہوتا وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے وہ تھوڑا بولنے والا ہے کچھ لوگ جھوٹ بول کر اور اونچا بول کر اپنی جھوٹی بات منوا لیتے ہیں۔قرآن مجید میں حضرت لقمان کی زبان سے کہا گیا ہے کہ اپنی پوری زندگی میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز کو دھیما رکھو اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ اونچی آواز کوئی اچھی آواز ہوتی تو گدھے بڑی مستحسن آواز ہوتی ہے اور اُس کو رنگ ٹون بنایا جاتا ہے اور یہ ہوتا ہے اور یہ ہوتا ہے اس کو کوئی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔دلیل سے بات کرو اور اپنی بات منواؤ بس یہی ٹھیک ہے۔

یہ حضرت لقمان کی نصیحتیں ہیں ایک معقول انسان کی اور اللہ کو اتنی پسند آئیں اور اتنی معنویت ہے ان میں کہ اللہ نے انہیں وحی بنا دیا اور آپ پر اور مجھ پر اتمام حجت کر دیا۔ آدمی اولاد سے کتنا ہی FRANK ہو اور ہر موضوع پر بات کر لیتا ہو پھر بھی چند باتیں ایسی ہیں کہ انسان نہیں بتا سکتا۔ اس میں جو تھوڑا سا خلا تھا وہ اللہ نے پُر کر دیا ہے وہ آیتیں درمیان میں ہیں۔ فرمایا: وَ وَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ انسان کتنا ہی FRANK ہو اولاد سے یہ کہنا بہر حال مروت کے خلاف لگتا ہے کہ بیٹے والدین کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ادب سے بات کرنی چاہیے اور احترام کرنا چاہیے۔ اللہ نے فرما دیا کہ خود حضرت لقمان نہیں بتا سکے ہم بتا دیتے ہیں۔ ہم نے وصیت کی ہے انسان کو کہ والدین کے کچھ حقوق ہیں اُن سے نیک سلوک اختیار کرو۔ اور حدیث میں ہے کہ والد کے مقابلے میں والدہ کا حق حسن سلوک میں تین گنا زیادہ ہے، والد کے ساتھ بھی نیک سلوک کرنا چاہیے لیکن والدہ کا حق والد کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے۔

آ گے فرمایا والدین کا کہنا مانو اُن کی اطاعت کرو۔ لیکن اگر تمہارے والدین شرک پر امادہ کرنے کی کوشش کریں تو والدین کا کہنا بھی مت مانو۔ وَ اتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَيَّ پیروی تو صرف اس کی ہوگی جو شرک سے بچا ہوا ہے اور ایک اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ والدین کا حق اپنی جگہ لیکن وہ شرک جیسے غلط کام پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک ہو گا لیکن فرمایا اگر وہ شرک پر آمادہ کریں جیسے حضور ﷺ کے دور میں تھا جب آپ مکہ میں تھے بہت سارے نوجوان مسلمان ہو گئے لیکن اُن کے والدین مشرک تھے۔ ایک طرف اللہ کے رسول کا حکم ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ جاؤ مسلمان ہو جاؤ۔ دوسری طرف قرآن نے حکم دے دیا کہ والدین کا کہنا مانو تو والدین کہتے ہیں شرک کرو، اپنے دین میں واپس آ جاؤ۔ اللہ نے وہاں وضاحت کر دی ہے کہ باقی ساری باتیں والدین کی ماننی چاہییں حسن سلوک کرنا چاہیے لیکن اگر وہ شرک پر امادہ کریں تو والدین کی یہ بات نہیں ماننی۔ والدین کے کچھ حقوق ہیں لیکن اُن حقوق میں کچھ استثنٰی ہے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اگر مشرک والدین ہوں تو پھر بھی والدین کا ادب، احترام اُن کو نان نفقہ دینا ضروری ہے اگر خود اے سی لگائے گا تو والدین کو بھی اے سی لگا کر دینا چاہیے چاہے وہ مشرک و غیر مسلم ہوں۔ جو تمہارا معیار ہے تو اُن کو بھی دو اور اگر مسلمان ہوں تو اور زیادہ حقوق بن جائیں گے۔ اگر

والدین کسی غلط کام پر امادہ کریں تو وہاں والدین کا کہنا نہیں مانا جائے گا۔ اتباع ہو گا صرف محمد رسول اللہ ﷺ کا، وہ ہیں ہمارے لئے اُسوۂ کامل۔ والدین اُسی لائن میں ہیں تو ٹھیک ہے بڑی اچھی بات ہے اُن کا کہنا بھی مانیں گے لیکن اگر والدین اُس سے ہٹ گئے ہیں۔ کوئی کسی غلط بات کا تقاضا کرے تو پھر نہیں پھر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی بات چلے گی بس۔

حضرات! میرے نزدیک یہ وہ باتیں ہیں جن کا قرآن مجید میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ والدین اور اولاد کی یہ ذمہ داریاں ہے اور حضرت لقمانؑ کے حوالے سے ہیں کہ خود والدین کو اس پر توجہ دینی چاہیے اور خود بھی اختیار کرنی چاہیے اور یہ یہی باتیں اپنی اولاد میں پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بچپن سے ہی ان کے ذہن میں ڈالنا چاہیے۔ پہلی بات کہ شرک نہیں کرنا اللہ کے برابر کسی کو نہیں لانا برابر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا حکم ماننا ہے اگر آپ اللہ کا حکم چھوڑ کر کسی اور کا حکم مانے گیں تو آپ نے اللہ کے برابر کر دیا بلکہ اوپر کر دیا۔ اللہ کے حکم کے مقابلے میں ''لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق'' اللہ کی اطاعت چھوڑ کر کسی اور کی اطاعت کر لینا ممکن نہیں رہا۔ اللہ کے حکم کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا چاہے والدین آجائیں۔ یہی شرک ہو جائے گا اور شرک بہت بڑی ناانصافی ہے۔ اولاد کو سمجھانا چاہیے اُس کی قسمیں بتانی چاہیے اُس کے انداز بتانے چاہیے۔ خود بچنا چاہیے اُن کے سامنے نمونہ بن کر دکھانا چاہیے اور پھر یہ کہ آخرت کا تصور پیدا کرنا چاہیے خود احساس پیدا کریں ایک ایک بات کا حساب ہونا ہے اللہ کے ہاں مرنے کے بعد وہاں نہ برادری پوچھی جائے گی نہ رشتہ داری پوچھی جائے گی صرف اعمال کام آئیں گے بس۔ خاک روب کا بیٹا ہو.................. بڑا اچھا آدمی ہے اس کے لئے وہاں شفارش کی بھی ضرورت نہیں اور اپنے آپ کو سید لکھتا ہو، راجپوت لکھتا ہو یا شاہ صاحب لکھتا ہو لیکن عمل اچھے نہیں ہے تو پکڑے جائیں گے جہنم میں جائیں گے۔ اور تیسری یہ کہ یا بنی اقم الصلوٰة نماز قائم کرو اور و امر بالمعروف و انه عن المنکر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرو اور وَ اصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ بہت مشکل کام اور سب سے مشکل کام یہ ہے برداشت پیدا کرو تمہاری زندگی میں ثابت قدمی ہونی چاہیے مستقل مزاجی ہونی چاہیے۔ دین کے احکام میں مستقل مزاجی (STEAD FASTNESS)، ثابت قدمی ہو اور اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ یہ بات اگر مل جائے تو واقعی

انسان بہت خوش نصیب ہے۔اس کے لئے کردار پیدا کرنا پڑے گا۔تب ہی یہ ملے گی۔ایسے ہی دعویٰ کرنے سے نہیں مل جائے گی اور پھر مزید نصیحت اور وصیتیں بھی ہیں۔ یہ باتیں ہیں جو ہم کو بحثیت والدین خود اختیار کرنی چاہیے اور نمونہ بن کر اپنی اولاد کو یہی باتیں ٹرانسفر کرنی چاہئیں۔ جو آج نوجوان ہیں وہ سمجھیں کہ آج ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں۔اب یہ اگلا میدان ہے کہ اگر کسی کے والدین نہیں کرتے یہ تبلیغ کا حصہ ہوگا کہ ان کو بھی نماز کا سمجھائیں جس کی والدہ نماز نہیں پڑتی وہ والدہ کو سمجھائے کسی وجہ سے وہ نہیں کرسکی اب نوجوان کو موقع مل گیا۔ یہ اب تفاصیل ہیں دنیا میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے والد کو سمجھاتے رہے۔کسی کی بہن ہے وہ نماز نہیں پڑتی کسی کے بھائی نماز نہیں پڑتے اُن کو سمجھائیں گے لیکن اُصول یہی ہوگا کہ والدین آج سمجھیں اور اولاد کو سمجھائیں۔ جو نوجوان ہیں وہ آج سے عمل کریں گے تو مستقبل میں اُن کے کندھوں پر ذمہ داریاں آنے والی ہیں کل کو وہ اس فرض کو ادا کرنے والے بن جائیں گے اور ہم اس دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی کامیاب ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو ان باتوں کی سمجھ اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

ان شاء اللہ العزیز

اللہ اکبر بسلسلہ اتحاد و بیداری و تحفظ امت مسلمہ

دوسری

سہ روزہ **فکر و تدبیر کانفرس**

جمعہ، ہفتہ، اتوار 8،9،10 اکتوبر 10ء

مقام: مسجد بلال جھوک نواز ضلع وہاڑی پنجاب

منجانب: بلال اسلامک سنٹر

03007599197

03026997231

حکمت بالغہ

ماہ نومبر 2010ء کا شمارہ

خاص اہمیت کا حامل ہوگا

اس میں......تین اہم مضامین ان شاء اللہ شامل ہوں گے۔

(1) حضرت علامہ اقبال کے وژن (VISION) کی روشنی میں برطانوی ہند کے مسلمانوں کی تاریخ (1910ء ــــ 2010ء)۔ تین قسطوں میں 1998ء تک کے حالات پر تفصیلات شائع ہوچکی ہیں۔ اب 1998ء سے 2010ء کے حالات پر تحریر شامل اشاعت ہوگی۔

(2) قرآن اکیڈمی جھنگ میں 20 نامور شخصیات پر ماہوار سیمینار منعقد ہوئے تھے، جن کی تفاصیل بعد میں حکمت بالغہ کے صفحات کی زینت بنیں۔ ان میں سے آخری شخصیت 'حضرت علامہ اقبال' کے حالات اس اشاعت میں شامل ہوں گے۔

(3) حضرت علامہ اقبال کے نزدیک یورپی اقوام میں سے جرمن قوم کا ایک منفرد مزاج ہے انہوں نے ''پیام مشرق'' کے دیباچے میں اپنے قلم سے اس پر قدرے تفصیل درج فرمائی تھی۔ جرمن قوم کے اس منفرد مزاج کا تاریخی، ثقافتی اور سیاسی پس منظر کیا ہے؟ اس پر ایک تحریر بھی ان شاء اللہ اس شمارے میں آرہی ہے۔

اس طرح نومبر 2010ء کا شمارہ خواہی نخواہی

علامہ اقبال نمبر

کی صورت اختیار کر جائے گا۔ (ادارہ)

یہ لوٹ کھسوٹ کا دور کب ختم ہو گا؟

فرمانِ خدا (فرشتوں سے)

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے کُنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا زمانہ
جو نقشِ کُہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دَیر بجھا دو!
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے میرے لئے مٹّی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو